بیاد: حضرت الحاج حافظ عبدالستار صاحب عزیزیؒ

دینی، دعوتی، علمی، ادبی، تحقیقی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماھنامہ نقوشِ اسلام

Issue.No.10,11	January,February2020-جنوری/فروری ۲۰۲۰ء	VOL.No.14

مجلس سرپرستان

مرشدالامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ولی مرتاض حضرت مولانا سید مکرم حسین سنسارپوری
شیخ طریقت حضرت مولانا قمرالزماں الہ آبادی
نمونۂ سلف حضرت مولانا سید محمد سلمان مظاہری

مجلس مشاورت

مولانا سعیدالرحمٰن اعظمی ندوی — مولانا بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی
مولانا سعیدالرحمٰن فیضی ندوی — مولانا محمد اکرم ندوی
مولانا محمد عامر صدیقی ندوی — الحاج موسیٰ اسماعیل درسوت
مولانا محمد احمد صالح جی، — مولانا حسن مرچی
مولانا یحییٰ بام، مولانا رشید احمد ندوی، مولانا محمد منذر ندوی

مجلس ادارت

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ❁ مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری ❁ مولانا حمیداللہ قاسمی کبیرنگری

چیف ایڈیٹر
محمد مسعود عزیزی ندوی

مدیر انتظامی
ڈاکٹر مرغوب عالم عزیزی

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

NUQOOSH-E- ISLAM
MUZAFFARABAD.SAHARANPUR.247129
(U.P)INDIA.Cell.09719831058
E.mail : nuqooshe_islam@yahoo.co.in
masoodazizi94@gmail.com
www. nuqoosheislam.com , www. mifiin.org
ماہنامہ ”نقوش اسلام“ مظفرآباد، سہارنپور 247129 (یوپی) انڈیا

شرح خریداری

ہندوستان کے لیے

فی شمارہ..................۲۰/روپئے
سالانہ....................۲۴۰/روپئے
خصوصی...... ......۵۰۰۰/روپئے
ایشیائی، یورپی افریقی وامریکی ممالک کے لیے ۵۰/ڈالر

رسالہ کے جملہ امور سے متعلق اس نمبر پر رابطہ کریں: 09719639955

منیجر توسیع واشاعت: قاری محمد صالحین
Mob: 09813806392

Markazu Ihyail Fikril Islami , A/C No. 30416183580,S.B.I
Monthly Nuqoosh-e-Islam, A/C No. 30557882360,S.B.I

PRINTED, PUBLISHED AND OWNED: MD FURQAN
PRINTEDAT LUXMI PRINTING PRESS SAHARANPUR
EDITOR: MD FURQAN

Files\A017.TIF not found. Files\A025.TIF not found. Files\A017.TIF not found.

اس شمارے میں

عناوین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ		۳
حضرت مولانا برہان الدین سنبھلیؒ	محمد مسعود عزیزی ندوی	
تجزیہ		۷
مولانا علی میاں ندویؒ - چند کارفرما عناصر	مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی	
جائزہ		۱۲
موجودہ تمام مسائل کا صرف ایک حل	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	
عظمت دین		۱۵
دین اور اس کی ضرورت	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی، علی گڑھ	
حالات حاضرہ		۱۹
بھارت کی تاریخ کا نازک موڑ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	
یاد رفتگاں		۲۵
حضرت مولانا طلحہ صاحب کاندھلویؒ	حمید اللہ قاسمی کبیر نگری	
دعوت اصلاح		۲۸
زندگی کے مسائل ومشکلات اور انکا حل	محمد مسعود عزیزی ندوی	
رہنمائے طلبہ		۳۲
طلبہ تحریک کی تاریخ	ڈاکٹر عبد الحمید اطہر ندوی	
غور وفکر		۳۶
مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار کون؟	مولانا برہان الدین قاسمی، ممبئی	
حسین یادیں		۳۸
مولانا قاری عاشق الٰہی صاحبؒ	محمد مسعود عزیزی ندوی	
حقیقت یا سراب		۴۱
جب میری وفات ہوئی	پروفیسر اظہار الحق، اسلام آباد	
اصلاحیات		۴۴
اللہ تعالیٰ کی مخلوق ''جن'' کے حالات	مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری	

ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے لئے شرح اشتہار

ٹائٹل صفحہ آخر رنگین (فل سائز)	۳۰۰۰
// // اول اندرونی // //	۲۵۰۰
// // آخر اندرونی // //	۲۰۰۰
صفحہ اندرونی (فل سائز)	۱۰۰۰
آدھا صفحہ اندرونی	۶۰۰
۱/۴ صفحہ //	۴۰۰

نوٹ: شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت سہارنپور کو ہی ہوگا۔

پرنٹر پبلیشر: محمد فرقان نے لکشمی آفسیٹ پریس سہارنپور میں طبع کراکے دفتر ماہنامہ نقوش اسلام مظفر آباد سے شائع کیا

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر: مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور، یوپی (الھند)

اداریہ

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی

اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے

محمد مسعود عزیزی ندوی

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ایک متبحر عالم دین، زبردست فقیہ، ایک کامیاب مدرس، شفیق استاد، دوراندیش مربی، بہترین حافظ قرآن اور مجود تھے، حضرت مولانا موصوف اپنی بہت سی علمی ودینی خصوصیات کے باوجود ایک اصولی آدمی اور متصلب حنفی تھے، انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کے بعد دہلی فتحپوری میں درس وتدریس کی خدمات انجام دی اوراعلی کتابیں پڑھائیں، وہاں ایک عرصہ تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آ گئے، اور وہاں درس وتدریس کے ساتھ مختلف شعبوں میں ترقی کرتے رہے، اور بالآخر صدر شعبہ تفسیر بنے، اس درمیان ان سے ہزاروں طلبہ نے کسب فض کیا، ان کی تبحر علمی، نکتہ آفرینی اوران کے علمی لطائف وحکم کی بنا پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ ان کو حکیم الاسلام کہا کرتے تھے، بلکہ عشاء بعد حضرت مفکر اسلام کی مجلس میں ان کی موجودگی سے باغ وبہار آ جایا کرتی تھی، کیونکہ وہ طلبہ کے ذوق ومزاج کے مطابق اور جس سے طلبہ کو زیادہ فائدہ ہو، ایسے سوالات مفکر اسلام سے کیا کرتے تھے، اور پھر مفکر اسلام ان سوالات کے جب جوابات دیا کرتے تھے تو حضرت مولانا برہان الدین صاحب حضرت مفکر اسلام کی باتوں کو مزید مدلل کر کے نکتے پیدا کرتے تھے، اور خود بھی محظوظ اور لطف اندوز ہوتے اور مفکر اسلام اور طلبہ بھی، غرضیکہ حضرت مفکر اسلام کی مجلس مولانا برہان الدین کی وجہ سے ہم جیسے طلبہ کے لئے پر بہار ہو جایا کرتی تھی، ان کی عدم موجودگی اور بعض مرتبہ موجودگی میں بھی حضرت مولانا نذر الحفیظ صاحب بھی طلبہ کیلئے ایسے سوالات کرتے تھے، جس سے طلبہ کو فائدہ ہو اور حضرت مفکر اسلام بڑی بشاشت سے جواب دیتے تھے اور بعض اوقات مولانا شمس الحق صاحب ندوی بھی مجلس کو پر رونق کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر حضرت مولانا برہان الدین صاحب کا برمحل علمی استدلال پھر اس میں لطیف اشارہ اوران کا اچھلنے کا انداز اور بات میں زور اور طاقت پیدا کرنے کا آئیڈیا اور ہاتھوں کا اشارہ ایسا ہوتا تھا کہ حضرت مفکر اسلام کی مجلس میں اتنا مزہ آتا تھا جس کی نظیر نہیں، طبیعت چاہتی تھی کہ یہ مجلس طویل سے طویل تر ہو جائے، مگر حضرت کے آرام کا وقت ہو جاتا تھا اس لئے مجلس برخاست ہو جاتی تھی۔

❁❁❁❁❁ ——— ❁❁❁❁❁

راقم سطور کا ندوۃ العلماء میں عالیہ ثانیہ (ششم عربی) میں ۱۹۹۵ء میں داخلہ ہوا، تو مولانا سے تعلقات شروع ہوئے،

اسی سال راقم کی پہلی کتاب ''مختصر تجوید القرآن'' ششماہی امتحان کی چھٹی کے بعد چھپ کر آئی تھی، ندوۃ العلماء کے اکثر اساتذہ کو پیش کی، جس سے اساتذہ کی توجہ بھی بڑھی، مولانا برہان الدین صاحب نے بھی اس کتاب پر اپنے تأثرات لکھے، اس کے بعد درجہ ہشتم (عالیہ رابعہ) میں حضرت مولانا سے ابوداؤد پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس سے اور تعلق میں اضافہ ہوا، مولانا مزید شفقت فرمانے لگے، مولانا چونکہ اصولی آدمی تھی، ابوداؤد شریف کا صبح پہلا گھنٹہ تھا، اگر کوئی طالب علم حاضری کے بعد آیا، یا حاضر نہ ہوا، تو اگلے روز اس سے باز پرس کرتے، اسے پوچھتے رہتے جب تک کہ وہ کوئی معقول عذر نہ بیان کرتا، مگر خدا جانے ناکارہ اس اصول سے کیسے مستثنیٰ رہا، ایک دو مرتبہ بھی ایسا ہوا، حاضری کے بعد درجہ میں آنا ہوا، تو مولانا نے اتنا ہی پوچھا، کہاں تھے اور آگے بڑھ گئے، سوال وجواب کی چکی میں پسنے کی نوبت نہ آئی، میں اس وقت بھی حیرت میں پڑتا تھا اور بعد میں بھی کہ میرے ساتھ یہ مشفقانہ رویہ کیوں؟، مولانا کے سبق میں بہت مزہ آتا تھا، ان کے درس کی ایک تو خصوصیت یہ تھی کہ ۴۵؍منٹ کا گھنٹہ معلوم ہی نہیں کیسے چند لمحوں میں ختم ہو جاتا تھا، مولانا کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اسباق گویا گھول کر پلانے کا ہنر جانتے تھے اور ہر بات اور مسئلہ کو دل ودماغ میں بٹھاتے جاتے تھے، عجیب اللہ تعالیٰ نے ذہانت، فطانت، طرز تدریس، افہام وتفہیم کا نرالا انداز بخشا تھا، اور مولانا صرف سبق ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ سبق کی روح سے خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے، اور مزہ لیتے تھے، اچھل اچھل کر پڑھاتے تھے اور اپنے طلبہ کو بھی محظوظ اور لطف اندوز کرتے تھے، ہشاش بشاش چہرہ اور مسکراہٹ کے ساتھ گویا طلبہ کے ذہن ودماغ میں علم ومعرفت کے ڈول انڈیل رہے ہیں، چٹکیوں میں مسئلہ کا حل پیش فرماتے تھے، فضیلت، تخصص فی الفقہ والافتاء کے درجہ میں حضرت مولانا سے بخاری شریف کا ابتدائی حصہ کتاب العلم تک پڑھا، اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی معرکۃ الآراء کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''احکام القرآن للجصاص'' بھی پڑھی۔

✡✡✡✡✡ ✡✡✡✡✡

عالمیت کے آخری سال میں جب مولانا سے ابوداؤد شریف پڑھ رہا تھا، مولانا کا حضرت تھانویؒ پر تھانہ بھون میں ہونیوالے سیمینار میں شرکت کا پروگرام تھا، مولانا نے رفیق سفر اور خادم کے طور پر میرا انتخاب کیا کہ تمہیں ساتھ چلنا ہے، چنانچہ راقم کا بھی ٹکٹ بنوایا، اور بطور خادم حضرت مولانا کے ساتھ تھانہ بھون حاضر ہوا اور حضرت تھانوی پر ہونیوالے سیمینار میں شرکت ہوئی، اگلے روز ایک نشست اس پروگرام کی دارالعلوم وقف دیوبند میں بھی تھی، وہاں بھی شرکت کی اور دیوبند میں ہی مولانا کے ایک اہل تعلق کے یہاں قیام رہا، مولانا کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں ان کے رفیق درس مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ اور مولانا نعمت اللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، پھر ایک روز کے لئے راقم دیوبند سے گھر آ گیا اور مولانا لکھنؤ تشریف لے گئے، اس کے چند مہینے بعد مولانا کے ساتھ جامعہ بیت العلوم پپلی مزرعہ ہریانہ جانا ہوا، اور وہاں سے سرہند امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کی خانقاہ اور ان کے مزار پر حاضری ہوئی، وہاں کے ایک سجادہ

جو غالباً حیدرآباد کے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، انہوں نے خیر وعافیت کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی خیریت دریافت کی، مجھے تعجب سا ہوا، مولانا نے بتلایا اس زمانہ میں جو مفکر اسلام کو نہ جانتا ہو، اس سے بڑا جاہل کون ہوسکتا ہے، ہم دوپہر کا کھانا ساتھ لیکر گئے تھے، حضرت مجدد صاحب کی خانقاہ کے ایک کمرے میں ہم لوگوں نے دسترخوان لگایا، تو حضرت مولانا برہان الدین صاحب نے فرمایا کہ لنگر کا کھانا بھی لاؤ، یعنی جو خانقاہ کا کھانا مہمانوں کے لئے بنا ہے، چنانچہ حضرت مولانا نے اس میں بھی شرکت کی، پھر وہاں سے براس جانا ہوا، جہاں پر حضرت تھانوی کے کشف کے مطابق ۱۳/انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی قبریں ہیں، وہاں بھی ایصال ثواب کیا، اس کے بعد شام کو پلی مزرعہ آ گئے، اگلے روز غریب خانہ پر مظفرآباد تشریف لائے، دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کیا، بجلی بھی نہیں تھی، سخت گرمی میں کھانا کھا کے آرام کیا، پھر شام کو سہارنپور مظاہر علوم میں آ گئے، وہاں حضرت شیخ یونس سے ملاقات کی، شیخ یونس نے بھی مولانا کا اچھا استقبال کیا، عشاء کے بعد الگ سے شیخ نے مولانا کے ساتھ مجلس کی، اور تربوز بھی کھلایا، رات میں مظاہر علوم کے مہمان خانہ میں قیام کیا، اگلے دن لکھنؤ کے لئے واپسی ہوئی، اس طرح مولانا کی عنایتیں اور شفقتیں بڑھتی رہیں اور فراغت کے بعد بھی مزید اضافہ ہوتا گیا۔

فراغت کے بعد جب راقم نے ایک ادارہ مرکز احیاء الفکر الاسلامی کے نام سے قائم کیا، تو برابر اس کی تعمیر وترقی کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے، اور جب لڑکیوں کے ادارے میں ۲۰۰۵ء میں پہلی مرتبہ بخاری شریف کے ختم کا پروگرام بنا، تو مولانا ہی تشریف لائے، اور بخاری کی آخری حدیث پر زبردست کلام کیا، جو بعد میں کتابی شکل میں ''بخاری شریف کی آخری حدیث کے دو آبدار موتی'' کے نام سے شائع ہوا، اور بہت پسند کیا گیا، بلکہ اس کے بعد بہت سے مدارس میں آخری حدیث کی تقریر کو اسی انداز پر شائع کیا گیا، اس طرح حضرت مولانا کی شفقتوں اور عنایتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا رہتا، لکھنؤ حاضری کے موقع پر ہمیشہ کھانے کی دعوت دیتے، مگر راقم ہمیشہ شیخی ومرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ العالی کا مہمان ہونے کی وجہ سے مہمان خانہ میں کھانا کھاتا، صرف ایک مرتبہ مولانا کی دعوت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، البتہ ناشتہ وغیرہ ہمیشہ کیا، راقم اکثر ہر حاضری پر کچھ ہدیہ پیش کرتا تھا، جس پر مولانا فرماتے کہ ''ہر مرتبہ ٹھیک نہیں، اس سے عادت خراب ہوجائیگی'' دوسال قبل راقم کا بچہ عزیزم عبداللہ عزیزی ساتھ تھا، تو مولانا نے اس کو پانچ سو روپئے دئے اور دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اب اخیر کے دس بارہ سالوں سے مولانا فالج کے حملہ کے بعد معذور سے ہوگئے تھے، آواز بھی صاف نہیں رہی تھی، مگر اس معذوری کے باوجود، پروگراموں، سیمیناروں، علمی مجلسوں اور جلسوں میں ضرور شریک ہوتے تھے، حالانکہ ان کو وہیل چیئر پر لے جایا جاتا تھا، حضرت مولانا سے زمانہ طالب علمی میں پڑھا تو تھا مگر سند نہیں لی تھی، امسال رمضان سے قبل مولانا سے حدیث کی سند بھی لی تھی، آپ براہ راست شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے آخری سال کے شاگردوں میں سے تھے۔

مولانا کے ہزاروں شاگرد دنیا کے مختلف ملکوں میں اور خود ندوہ میں دینی وعلمی خدمات انجام رہے ہیں، مولانا کا درس وتدریس کے ساتھ علمی مجلسوں میں شریک ہونے کا بھی معمول تھا، جس کے لئے انہوں نے متعدد ملکوں کے اسفار بھی کئے ہیں، سینکڑوں ان کے علمی مقالات اور مضامین ہیں اور متعدد علمی تصنیفات بھی ہیں، اس طرح ان کا علمی فیض بھی جاری ہے، چند سال قبل ان کو مولانا طلحہ صاحب کاندھلوی نے خلافت بھی عطا کی تھی، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی بھی ان کے قدرداں اور ان کی علمی لیاقت کے قائل اور معترف ہیں، مولانا اپنے معمولات کے پابند اور نماز باجماعت کا اہتمام کرنے والے اور فقہی مسائل میں پکے حنفی تھے۔

اخیر کے دنوں میں جب مولانا سے ملاقات ہوتی اور خیر وعافیت معلوم کی جاتی تو فرماتے: ''کہ نہ مرض میں اضافہ ہے نہ افاقہ'' یہ بات ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرماتے، حضرت مولانا کی بہت سی خصوصیات تھیں، جو ان کے دوسرے شاگردوں نے بھی لکھی ہوں گی، ان سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، راقم نے اپنے اس مضمون میں مختصر سے تاثرات اور مولانا کی شفقت وعنایت پر مشتمل چند باتیں تحریر کردی ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے، حضرت مولانا نے صدقہ جاریہ کے طور پر نیک صالح صلبی اولاد اور ہزاروں شاگردوں کی شکل میں روحانی اولاد کے ساتھ تصنیفی میدان میں بھی اپنے علمی مآثر چھوڑے ہیں، معذوری کی حالت میں بھی حضرت مولانا کا فیض جاری تھا، مگر اخیر میں طبیعت زیادہ ناساز ہوئی اور بالآخر ۱۹/جنوری ۲۰۲۰ء جمعہ کے روز واصل بحق ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، ۲۱/جنوری سنیچر کے روز نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی، اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں اپنے پاک لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تجزیہ

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی شخصیت کی تشکیل میں
چند کارفرما عناصر

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نائب ایڈیٹر پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ

حضرت مرشد مخدوم و معظم مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی قدس سرہ کی بلند قامت و بیش قیمت اور خوش قسمت شخصیت کو اللہ تعالی نے وہ مقام اور درجہ دیا جو کم شخصیتوں کو حاصل ہوا ہوگا، ان کی وفات کے وقت کی کیفیت اور وصال سے یہ اور زیادہ واضح ہوگیا، آپ کی فکری بلندی، علمیت اور ساری انسانیت کے لئے دردمندی وفکرمندی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ کے سانحہ وفات کا غم عرب وعجم میں یکساں طور پر محسوس کیا گیا اور لوگوں نے اسے ملی اور اجتماعی خسارہ کے ساتھ اپنے ذاتی نقصان سے بھی تعبیر کیا، یہ محبوبیت اور مقبولیت آپ کو کیونکر حاصل ہوئی؟ اس میں آپ کے کمالات کے ساتھ حسنات کو بڑا دخل ہے، جہاں آپ کو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مجمع الکمالات لکھا تھا، وہیں ایک موقع پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے مجموعہ حسنات بھی کہا تھا، یہ یقیناً آپ کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ایک روشن خاندانی پیش منظر کے ساتھ پاکیزہ ماحول اور ماہرفن و صاحب طہارت وتقوی اساتذہ میسر آئے۔

یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ کسی بھی بڑی شخصیت کے پیچھے اس کے خاندانی بیک گراونڈ کو بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ ایسا پہلو ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی کسی ایک زمانہ سے یا کسی ایک ماحول میں کچھ امتیازی خصوصیات رہی ہوں یا صرف دو تین پشت سے صالح وپارسا لوگ رہے ہوں ایسا نہیں تھا جب کہ کسی کی شخصیت سازی میں یہ چیز بھی اثر ڈال کر رہتی ہے، اور صالح ماں باپ اور پارسا دادا اور نانا کا ثمرہ اولوالعزم بیٹے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی، سرور کائنات آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے محبوب داماد سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے لیکر ہندوستان میں اس خاندان کے مورث اعلی امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی تک ایک محفوظ خاندانی تاریخ ملتی ہے، امیر کبیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجہ تھے، یہ وہ شخص جیلانی تھے، جنہیں آج بھی دنیا ''پیران پیر'' کے نام سے یاد کرتی ہے، ان دونوں بزرگوں کے خون میں اس عالی مرتبت شہید کا خون تھا جنہیں محمد ذوالنفس الزکیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جنہیں حمیت دینی وغیرت ایمانی خاندانی ورثہ میں ملی تھی اور جنہوں نے خلیفہ منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا اور اس وقت کے ائمہ فقہ و دین خصوصاً امام مالک وامام ابوحنیفہ ان کے ساتھ تھے، مدینہ منورہ میں انہوں نے ۱۴۵ھ میں جام شہادت نوش کیا۔

امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی کو جو چیز ان کے وطن سے کھینچ کر یہاں لائی وہ صرف جذبہ اعلائے کلمۃ اللہ تھا، جس کے لئے انہوں نے یہ عظیم قربانی دی اور دعوت وجہاد اور اصلاح کا کام کڑا مانکپور میں پڑاؤ ڈال کر شروع کیا، آپ کو اس میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی اس کی صراحت ووضاحت ہم کو صحیح طور پر نہیں ملتی؛ لیکن اتنا ضرور ہے آپ ہندوستان میں تاریخ اسلام کا ایک اہم باب بن گئے، آپ کی ذریت میں برابر ایک نہ ایک دعوت واصلاح اور تعلیم وتبلیغ سے وابستہ رہا اور عہدۂ قضاء آپ کی نسل میں جاری رہا؛ لیکن یہ لوگ شریعت کے معاملہ میں بڑے حساس اور باحمیت واقع ہوئے تھے، انہیں میں ایک قاضی سید احمد تھے جنہوں نے ایک شرعی فیصلہ

سنایا، فریق مخالف نے کہہ دیا کہ شریعت ودیعت ہم نہیں جانتے انصاف کرو، یہ سننے کی تاب نہ لاکر آپ نے اسی وقت وہاں سے رخت سفر باندھا اور نصیر آباد سے شہر رائے بریلی ہجرت کر گئے، انہی کے پڑپوتے حضرت شاہ علم اللہ حسنی ہیں جو سب سے پہلے تکیہ رائے بریلی آئے اور ایک مجذوب کامل کے جذبات کی رعایت میں اپنے طویل سفر کو یہیں پر ختم کر دیا اور اخلاص وتقوی پر اس جگہ کی بنیاد ڈالی جسے آج دائرہ شاہ علم اللہ اور تکیہ کلاں سے ہم جانتے ہیں، بدعت سے تنفر اور سنت سے وارفتگی اور اس پر عمل بہت بڑھا ہوا تھا (سلطان اورنگ زیب عالمگیر جن کو حضرت شاہ علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی انہی دنوں جب آپ کی وفات ہوئی خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی ہے، اور فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ کو آسمان پر لے گئے، عالمگیر کو اس خواب پر سخت پریشانی ہوئی، ملاجیون سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا غالباً شاہ علم اللہ فوت ہو گئے، چنانچہ خواب کی تاریخ لکھ لی گئی، پھر وقائع نویس کی رپورٹ سے تصدیق ہوگئی، ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ نمونہ دنیا سے اٹھ گیا) اورنگ زیب عالمگیر سلطان الہند نے آپ کی خدمت میں ایک پروانہ بھیجا اور بڑی آراضی قبول کرنے کی درخواست کی، آپ نے قبول نہ کیا، وہ قاصد زنانہ خانہ جا پہنچا اور یہ بات گوش گزار کی، اندر سے یہ آواز آئی کہ جاکے سلطان جی سے کہہ دو کہ ہمارا نان ونفقہ شاہ علم اللہ کے ذمہ ہے نہ کہ سلطان کے، مخدومی حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس سرہ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں تحریر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا: "اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا" کا جیسا ظہور سعادت کی اس شاخ میں ہوا ہے کہیں اور نہیں ملتا، راقم کا خیال ہے کہ اسی کا اثر تھا کہ مال کی فراوانی کا جذبہ امنڈتا یہاں نظر نہیں آتا، حضرت شاہ علم اللہ میں "حب المال رأس کل خطیئة" کا استحضار اتنا بڑا ہوا تھا کہ انہوں نے مزید اس کی دعا کی کہ مال کی بہتات سے یہ خاندان محفوظ رہے اور بقدر ضرورت ہی اس خاندان کو ملے، آپ کی دعا ایسی قبول ہوئی کہ بعد میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو اس میں کچھ وسعت اور فراخی کی دعا کرنی پڑی، شاہ صاحب کی اولاد کو دشوار گزار مرحلہ سے گزرنا پڑا مگر صبر کا دامن چھوٹنے نہ دیا، اس سخت مرحلہ میں بھی ان کی اولاد میں مال سے بے رغبتی اس قدر بڑی ہوئی تھی کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا شاہ ابوسعید حسنی کا واقعہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تلمیذ خاص اور ان کے بیک واسطہ خلیفہ تھے اور سلطان ٹیپو شہید کا خاندان ان سے وابستہ تھا، ان کی ہی جانب سے ایک خطیر رقم آئی آپ نے باہر رکھوادی کہ جس کا حق ہوگا وہ آ کر خود لے جائیگا، لوگ آتے گئے اور لیتے گئے یہاں تک کہ تجوری خالی ہوگئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شاہ علم اللہ کی دعا اور کوشش سے اس خانوادہ کا یہ مزاج بن گیا کہ ظلم اور مال میں بے احتیاطی ہی شرک وبدعت کے بعد بدترین جرم ہے۔

اس کے ساتھ یہ خاندان مردانگی، حمیت دینی اور جذبہ جہاد جیسے اوصاف سے متصف رہا اور یہ بات اس کے افراد میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی رہی، اسی لئے اس خاندان کی تاریخ میں ان اولو العزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا اور یہ چیز پورے کمال کے ساتھ حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے اندر جلوہ گر ہوئی اور اللہ نے ان کی ذات سے وہ عظیم کام لیا جس کے سایہ میں آج بھی ملک میں اور اس کے باہر بڑا خیر کا کام ہو رہا ہے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ میں ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو یہ صفات ننہیالی طور پر بھی اور دادیہالی طور پر بھی ملیں، حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب آپ کے نانا تھے، جو بڑے درجہ کے عارف باللہ تھے، جن کی تربیت یافتہ

مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادی تھے، مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی آپ کے دادا تھے جو شیخ کامل کے ساتھ مصنف ماہر اور مؤرخ کبیر تھے، ماں باپ جس پایہ کے تھے اس کی تفصیل جاننے کیلئے خود مخلصانہ کی کتاب ''حیات عبدالحئی'' اور ''ذکر خیر'' کا مطالعہ مفید ہوگا، مولانا کے دادیہال ونانیہال میں اتنا فرق ضرور تھا کہ نانیہال اپنی دینی حیثیت کے ساتھ دنیوی حیثیت کا بھی حامل تھا اور ایک خوشحال وباوجاہت گھرانا تھا جب کہ دادیہال خالص مولویوں کا گھرانہ مشہور تھا اور اسے جائیداد اور زمینوں سے کوئی سروکار نہ تھا، اس کے بجائے کتابوں کا ذخیرہ اور دینی علم تھا، باوجود یہ کہ دادا صاحب حکیم تھے اور مطب کرتے تھے اس کے باوجود گھر میں فاقہ کا ہوجانا کوئی اچنبھانہ تھا، یہی وجہ تھی والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب کی زوجہ والی کی وفات کے بعد شادی کا مسئلہ درپیش ہوا، تو نانا شاہ ضیاء النبی نے پیغام آتے ہی گھر میں یہ فیصلہ سنادیا کہ سید جوان صالح، عالم اور ہونہار ہیں، میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے نزدیک عزت وامارت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل دیکھنے کی چیز صلاح وعلم ہے، آخر یہ مبارک تقریب ہوگئی اور وہ نئے گھر آ گئی، مولانا کاروان زندگی جلد اول صفحہ ۳۳ رمیں رقمطراز ہیں:

''والدہ صاحبہ اپنے اس نئے گھر میں آئیں تو اس کا نقشہ انہوں نے وہی دیکھا جس کو وہ سنا کرتی تھیں، تنگی ترشی کا زمانہ، کبھی فراغت، کبھی فاقہ، گھر میں کئی کھانے والے اور دادا صاحب کی آمدنی برائے نام، ادھر نانی صاحبہ اپنی شفقت کی بنا پر اس ٹوہ میں رہتی تھیں کہ بیٹی کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے، کبھی کسی کو بھیجتیں کہ گھر میں کچھ پک رہا ہے؟ والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ جب میں کسی کو اپنے میکے سے آتا دیکھتی تو چولہے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلادیتی کہ معلوم ہو کھانا پک رہا ہے، حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا''۔

لیکن مولانا کی ہی زبان میں پھر وہ بہت جلد ایسی برکت اور ترقی ہوئی کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا کہ جس گھر میں گھر والوں کو خود کبھی کبھی فاقہ کرنا پڑتا تھا اب وہاں پر گھر سے زیادہ مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

خاندانی پس منظر کے تحت راقم اس جائے خاندان کا ذکر ضروری سمجھے گا جس کے انوار وبرکات کو حضرت آخر تک بیان فرماتے رہے، اپنے تجربات کی روشنی میں اور بزرگوں کے ملفوظات کی روشنی میں اور جب بھی کوئی دینی رونق وبہار یہاں دیکھتے تو فرماتے یہ بانی کا اخلاص ہے، یہ جائے خاندان دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں سے معروف ہے، حضرت مولانا فرماتے ہیں:

''یہ وہ جگہ ہے جس کی بنیاد ۱۰۵۰ رہجری میں عارف کامل حضرت سید علم اللہ حسنی نقشبندیؒ (خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ) کے ہاتھوں اسی جذبہ پر پڑی، جوان کے مورث اعلی اور اس ملت کے مؤسس اوّل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سینہ میں موجزن تھا اور جس کا مقصد: "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ" کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے، وہ نسبتی ہے جس نے اپنے اپنے وقت میں کبار اولیاء اللہ، مصلحین ومجاہدین پیدا کئے جن میں حضرت سید احمد شہید کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن اور تاباں ہے''۔ (کاروان زندگی صفحہ ۳۵)

اس دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں حضرت مولانا قدس سرہ کی ولادت باسعادت جمعہ کے دن ۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو ہوئی، ایک ایسے گھر میں آپ نے آنکھیں کھولیں جہاں پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے دعا اور مناجات اصلاح اور فکر امت کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، یہ وہ عامل تھا جس نے آپ کے اندر اسی کا ذوق وشوق اور اس کے لیے جذبہ پیدا کیا، چنانچہ مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے خود تحریر فرمایا ہے کہ ''والد صاحب عالم بھی تھے اور طبیب بھی، میری عمر مشکل سے ۶ یا ۷ رسال کی تھی، وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا

أَنۡفُسَكُمۡ وَأَهۡلِيۡكُمۡ نَاراً" پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا، پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا کہ حکیم جی نسخہ بتایئے، میں نسخہ بولتا، خدا کرنا کہ بڑے ہوکر مولانا کو دعوت و اصلاح اور تعلیم کے میدان میں اسی آیت کو سامنے رکھ کر ولولہ خیز تقریریں کرنی پڑیں۔

دوسری طرف مولانا رقمطراز ہیں: ''ہمارا گھرانہ علماء و مصنّفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانہ کے عظیم مصنفوں میں تھے، خاندانی وموروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور بچوں وبچیوں سب میں اس کے اثرات کم وبیش پائے جاتے ہیں، کچھ یہ آبائی اثر کچھ والد صاحب کا ذوق وانہماک ہمارے سارے گھر پر یہ کتابی ذوق سایہ فگن تھا، کتب بینی کا یہ ذوق اور ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے، تو کیسے یہ مصنف محقق نہ بنتے جب کہ بہنوں نے بھی اس وراثت میں اپنا حصہ لیا اور اس کے اثر کو قبول کیا، ابھی مولانا ۹/۸ سال کے ہی تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اس کا اثر اور اس کے نتیجہ میں مایوسی کی سی کیفیت کا پیدا ہونا فطری اور طبعی امر تھا جسے والدہ صاحبہ کی دعاؤں اور شفقت اور بھائی صاحب کی فکر وتربیت نے بہت جلد زائل کردیا، انہوں نے دل کھول کر آپ کی کامیابی وترقی اور بلند مقامی کے لئے ایسی دعائیں مانگیں جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی، اس کے ساتھ اصلاح وتربیت کی فکر رکھی، خطوط کے ذریعہ اور زبانی بھی توجہات جاری رکھیں، لمبی لمبی سورتیں یاد کرائیں، دعائیں یاد کرائیں، تین چیزوں پر ان کے یہاں زیادہ زور تھا، نماز، تلاوت اور تواضع، اس میں ان کے یہاں کوئی رعایت نہ تھی۔

بھائی کی فکر وتربیت میں جن دو تین باتوں پر زیادہ زور تھا وہ یہ کہ نماز جماعت کے ساتھ پابندی سے پڑھی جائے، اس میں وہ اتنے سخت تھے کہ ذرا بھی انہیں شبہ ہوتا تو وہ دوبارہ پڑھوادیتے تھے، دوسرے یہ کہ ادھر ادھر زیادہ بیٹھا نہ جائے اور ہر کسی سے بے تکلف نہ ہوا جائے، تیسرے یہ کہ ہر کتاب کو ہاتھ لگایا نہ جائے بلکہ وہ خود اپنے ذاتی کتب خانہ میں سے خود کتابیں انتخاب کرکے دیتے تھے اور مطالعہ کرواتے اور چاہتے تھے کہ پہلا نقش جس کتاب کا پڑے وہ سیرت کی کتاب ہو، چنانچہ مولانا کے ہاتھ پہلے ''سیرت خیر البشر'' آئی، پھر ''رحمۃ للعالمین''۔

بچپن کا ہی ذکر ہے تو کیوں اس کا ذکر کرتے نہ چلیں کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد نواب سید نور الحسن خان صاحب مرحوم کی کوٹھی میں مع پورے گھر کے منتقل ہوگئے، یہ انتقال مکانی آپ کے ذہنی اٹھان کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا اور دنیا سے مرعوبیت یکسر ختم ہوگئی، خود مولانا لکھتے ہیں: ''اس کوٹھی میں رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار لپٹ گئے اور دولت وامارت سے آنکھیں کبھی خیرہ نہیں ہوئیں، اس لئے کہ اس کا اعلی سے اعلی مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا، اس آزمائش اور امتحان سے نکلے تو کھیل کا شوق غالب آیا اور ساری دلچسپیاں وہیں محدود ہونے لگیں، کچھ تو ساتھیوں کا اثر تھا کچھ عمر کا تقاضا؛ لیکن بہت جلد کھیل کے ساتھیوں کی غیر شریفانہ بول چال اور چال ڈھال نے اور کچھ تو اس میں آپ کے کامیابی کے جذبہ کے فقدان نے اس ماحول سے آپ کو دور کردیا، خود مولانا کی زبانی سنیئے: میری عمر کا یہ زمانہ جو عربی اصطلاح میں'' مراہقہ فکری وجسمانی'' کا زمانہ تھا، بڑا آزمائشی اور ایک حد تک تاریک زمانہ تھا۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کاروان زندگی)

اس کے بعد مولانا کی ساری توجہ اور تگ ودو تعلیم کی طرف مرکوز ہوگئی اور اس کے نظم بنانے میں بھائی صاحب مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے جس فراست وبصیرت کا ثبوت دیا اس میں حکمت الٰہی کی کارفرمائی کھلے طور سے ظاہر ہوتی ہے، اس کا انہوں نے خصوصی طور اہتمام کیا کہ یہ فن اس کے ماہر سے پڑھیں اور پوری

دلجمعی ویکسوئی سے پڑھیں اور سکھانے والا محض ماہر ہی نہ ہو بلکہ اس کا باطن بھی صاف و چمکدار ہو۔

کچھ فارسی اور اردو ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھوا کر جو مولوی محمود علی صاحب اور چچا مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے ذمہ تھیں، شیخ خلیل عرب صاحب کے سپرد کر دیا اور عربی اول تا آخر انہی سے سیکھیں، مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ ''عرب صاحب کو صرف زبان کی ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ بھی حاصل تھا، بعض بعض عبارتوں پر وہ جھوم جاتے اور مست ہو جاتے تھے اور ڈوب کر پڑھاتے تھے''۔

اس کے ساتھ وہ بڑے پارسا، دردمند اور رونے والے تھے عرب صاحب کے اصرار وخواہش پر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تا کہ کلاسز میں بھی عربی پڑھ لیں، فاضل ادب کا امتحان دیا اور امتیازی نمبرات حاصل کئے لاہور میں مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں رہ کر قرآن مجید کے درس کی تکمیل کی اور اس درس میں باقاعدہ طالب علم بن کر رہے جس میں منتہی طلباء کو پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا اور یہی مولانا کا خاص مذاق تھا۔

حدیث شریف مولانا حیدر حسن خان صاحب ٹونکی شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بڑے اہتمام سے پڑھی اور صحیحین بخاری ومسلم اور ابوداؤد وترمذی حرفاً حرفاً ان سے پڑھی، مولانا کہتے ہیں: ''میری حدیث کی تعلیم سرتاپا ان کی شفقت اور مہارت فن کا نتیجہ ہے، وہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے مجاز تھے، نماز میں رقت وخشیت کا غلبہ ہوتا اور آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول جس میں گریہ غالب ہوتا، دوسرے حدیث کے استاذ مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں، ان کے متعلق خود مولانا لکھتے ہیں: درس حدیث کے علاوہ جس سے مولانا کی قوت تدریس اور شان محدثیت کا اظہار ہوتا تھا اور پوری فضا پر نورانیت اور سکینت کا سایہ معلوم ہوتا تھا میں نے مولانا سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لئے خصوصی وقت مانگا، استفادہ کا موقع ملا اور مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا۔

دیوبند کے اسی دوران قیام مولانا اعزاز علی صاحب سے جو فقہ کے فائق وممتاز استاد تھے فقہ پڑھی، ان کے علاوہ آپ نے اور جن ماہرین فن استادوں اور علماء سے استفادہ کیا، ایک شیخ تقی الدین بلالی مراکشی ہیں، جو عربی زبان میں سند کا درجہ رکھتے تھے، جن کے ساتھ آپ سفروں میں بھی ساتھ رہے اور علمی استفادہ کرتے رہے دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی ہیں اور مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ٹونکی اور خواجہ عبدالحئی فاروقی ہیں، جب کہ انگریزی میں ماسٹر خلیل الدین ہنسوی اور ندوہ میں انگریزی کے مشاق استاد ماسٹر محمد سمیع صدیقی ہیں، یہ سب کے سب اپنے علم وفضل کے ساتھ تقوی وطہارت کی صفات سے متصف تھے اور بعض تو اس میں بڑا پایہ رکھتے تھے کہ جن سے اللہ نے اشاعت علم وافادۂ درس کے ساتھ اصلاح نفس وتزکیہ کا اعلی پیمانہ پر کام کیا، ان سب کے ساتھ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ آپ کے اصلی معلم اور مربی واتالیق ایک ہی شخصیت تھی جس کو اللہ نے آپ کی شخصیت سازی کے لئے بنیادی ذریعہ بنایا وہ آپ کے برادر معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی ذات گرامی ہے۔

اخیر میں ہم اپنی بات کو مولانا کے ہی ایک اقتباس پر ختم کریں گے جو انہوں نے دوسرے مربیوں اور اتالیقوں کیلئے بطور نصیحت کے لکھا ہے وہ رقمطراز ہیں: ''ایک تجربہ ومشورہ کے طور پر اس کا بھی ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ بچوں کے مذہبی واخلاقی اٹھان اور ان کے اس قابل ہونے میں کہ اللہ تعالی ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے، دو چیزوں کا بڑا دخل ہے ایک یہ کہ وہ اپنی عمر کے مطابق ظلم اور دل آزاری سے محفوظ رہیں اور کسی دکھے دل کی آہ یا مظلوم کی کراہ ان کے مستقبل پر اثر نہ ڈالے، دوسرے یہ کہ ان کی غذا غصب حرام اور مشتبہ مال سے بظاہر محفوظ رہے، اللہ تعالی نے اس عاجز کے ساتھ ان دونوں چیزوں کا انتظام فرمایا''۔

جائزہ

موجودہ تمام مسائل کا صرف ایک حل

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا خالی جاتا ہو جس میں کسی بھی ادارہ یا تنظیم کی طرف سے مسلمانان ہند کے موجودہ مسائل پر کوئی کل ہند سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم یا مشاورتی نشست نہ ہوتی ہو، اسی طرح کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس میں قومی سطح کے اخبار میں کسی مسلمان لیڈر، عالم دین یا ایسے غیر مسلم دانشور کا انٹرویو شائع نہ ہوتا ہو جس کو مسلمانوں سے ہمدردی ہو اور اس کی گفتگو کا محور مسلمانوں کے موجودہ مسائل اور اس کا حل نہ ہو، ان سب کا خلاصہ ہم مندرجہ ذیل مسائل کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں:

''مسلمانوں کا تعلیمی میدان میں پچھڑا پن، اقتصادی معاشی بدحالی، سرکاری ملازمتوں میں کمی، ملکی سطح پر سیاسی میدان میں کم ہونے والی نمائندگی اور پارلیمنٹ واسمبلیوں میں ان کی گھٹتی تعداد، وقفہ وقفہ سے ہونے والے فسادات اور محکمہ پولس کی طرف سے ہونے والی ہراسانی، مسلم نوجوانوں کی آئے روز کی دھکڑ پکڑ، بے بنیاد الزامات کے ذریعہ ان کی گرفتاری، خود عدلیہ کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں ہونے والی ناانصافی وغلط فیصلے اور ان کے عائلی مسائل یعنی پرسنل لاء وغیرہ میں آئے روز مداخلت وغیرہ وغیرہ''۔

ان سب مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہم تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ان سب مسائل کے پیدا کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ ہے وہ ہمیشہ اس طرح وقفہ وقفہ سے ہمیں پریشان کرنا اور دینی، سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی میدان میں ہمیشہ ہمیں زک پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے کیا محرکات اور اسباب ہیں اور ان کی اس ذہنیت کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں؟

کیا اگر ہم اپنی سیاسی طاقت کے زور پر یا احتجاج کے ذریعہ حکومت وقت کو مجبور کر کے اپنے جائز مطالبات منوالیں، اپنی منصوبہ بندی کے ذریعہ ملت کی ان اقتصادی وتعلیمی کمیوں کو دور کرلیں، ہمیں اسمبلیوں میں اپنی آبادی کے اعتبار سے ریزرویشن یا الیکشن کے ذریعہ نمائندگی مل جائے یعنی ساڑھے پانچ سو ممبران پارلیمنٹ میں ۲۸ر کے بجائے سو مسلم ممبران پارلیمنٹ پہنچ جائیں، حکومت ۲۰ فیصد ریزرویشن سرکاری ملازمتوں اور ملکی اداروں میں ہمارے لیے مختص کردے، مسلم تعلیمی تناسب ۵۵ر فیصد کے بجائے سو فیصد ہوجائے، مسلمان پورے ملک میں معاشی میدان میں ترقی کی آخری منزل کو پہنچ جائیں اور ہماری پسماندگی کا خاتمہ ہوجائے، پورے ملک کی جیلوں سے ہمارے مسلم نوجوان رہا ہوجائیں اور عدالتوں میں ہمارے خلاف ہونے والے تمام فیصلوں کو حکومت پارلیمنٹ میں نیا قانون بنا کر رد کردے، غرض یہ کہ بالفرض اگر یہ ہمارے تمام معاشی، تعلیمی، سماجی، سیاسی اور دینی مسائل حل ہوجائیں تو کیا آپ کو اور ہمیں اس بات کا اطمینان رہے گا کہ ۶/۵ سال کے بعد ان فرقہ پرست ذہنیت کے حامل سرکاری افسران اور دیگر برادران وطن کی طرف سے دوبارہ ہمیں پریشان کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جائے گی یا پھر

کسی اور چور دروازہ سے ہمارے عائلی قوانین میں مداخلت اور نئی مسلم نسل کو ذہنی طور پر پریشان کرنے، سیاسی، تعلیمی اور معاشی میدان میں ہم کو پہلے سے زیادہ کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی؟

اس کا جواب یہی ہے کہ ہمارے ان سب مسائل کے حل ہونے کے باوجود ملک کے بڑے مناصب پر فائز ہمارے فرقہ پرست یہ برادران وطن جن کے ہاتھوں درحقیقت ملک کی زمام ہے پہلے سے زیادہ ہمارے خلاف منصوبہ بنانے میں لگ جائیں گے اور ان کا غیظ وغضب ہمارے خلاف پہلے سے زیادہ ہو جائے گا، اس لیے کہ ان کو جس بنیاد پر ہم سے نفرت اور وحشت تھی اس کا ازالہ نہیں ہوا اور جن عوامل کی وجہ سے وہ ہم سے بدظن تھے اس کا کوئی خاتمہ نہیں ہوا، اس کی مثال ویسے ہی ہے جیسے کسی مریض کے سردرد یا بخار کو ختم کرنے کے لیے نیم حکیم یہ نہ معلوم کرے کہ مریض اس تکلیف میں کس وجہ سے مبتلا ہے اور وہ اس کے محرکات کو جانے بغیر صرف بخار یا سردرد کا علاج کردے، نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے دن سردرد ختم ہونے کے بعد پھر کمر میں درد شروع ہوگا، بخار کے جانے کے بعد سردی اور زکام کا آغاز ہوگا، کامیاب حکیم وہی ہے جس کو اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگے کہ اس کے پیٹ کی خرابی کی وجہ سے ہی یہ سب بیماریاں اس کو لاحق ہو رہی ہیں، اس لئے اس کا صحیح علاج یہی ہے کہ پیٹ کی خرابی کا ازالہ کیا جائے تاکہ آنے والی تمام بیماریوں کا خاتمہ ہو سکے۔

اسی طرح آج ہمارا حال ہے کہ ہم مسائل کو تو حل کرنے پر اپنی توجہ مبذول کر رہے ہیں؛ لیکن یہ مسائل جن عوامل اور اسباب کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جا رہا ہے۔

اس ملک میں ہمارے ان سب مسائل کا جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں اگر سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے پس پردہ صرف ایک محرک نظر آتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ان کے دلوں میں موجود خدشات، شبہات اور غلط فہمیاں ہیں، اگر اس پر ہم سنجیدگی سے توجہ دیں اور ایک کامیاب حکیم کی طرح اصل مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے ازالہ کی کوشش کریں تو سرے سے ہمارے ان سب مسائل ہی کا خاتمہ ہو جائے، اس لیے کہ عالمی سطح پر اس وقت ناگفتہ بہ حالات کے باوجود دعوتی اعتبار سے دیگر خطوں بلکہ اکثر مسلم ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان کے حالات نہ صرف غنیمت بلکہ بہت بہتر ہیں جس کی ہمیں قدر کرنی چاہیے اور دعوتی نقطہ نظر سے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے، اس لئے کہ اب بھی الحمدللہ برادران وطن کی اکثریت اسلام کے تعلق سے بدظن ہونے سے محفوظ ہے اور ہماری تھوڑی سی کوشش سے ہی اسلام کے حق میں اس کے اچھے اثرات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

ہمیں جسم کی مختلف ظاہری بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے بدن میں پنپنے والے اس مرض کے ازالہ کی کوشش کرنی چاہئے جس کی وجہ سے آئے دن نت نئے امراض کی طرح امت مسلمہ کے سامنے اس طرح کے مسائل آرہے ہیں، ہمیں حکمت عملی، خیرخواہی اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ اپنے برادران وطن تک اس دعوت کو پہنچانا چاہئے جس میں خود ان کی ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی مضمر ہے۔

جدید ترقیات کی روشنی میں اسلام کی حقانیت وابدیت کو ثابت کرنا اس وقت جتنا آسان ہے ماضی کی تاریخ میں کبھی اتنا آسان نہیں تھا، اسی طرح ہمیں دعوت کے میدان میں جدید وسائل واسباب کا بھی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھرپور استعمال کرنا چاہئے اور اپنے ان برادران انسانیت تک بھی توحید ورسالت اور آخرت کے دلائل پہنچانے چاہئے جو کسی وجہ سے نہ

ہمارے پاس آرہے ہیں اور خاص حالات کی وجہ سے ہم بھی ان تک نہیں پہنچ پارہے ہیں، آپ کہیں گے کہ نہ ہم ان کے پاس جاسکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے پاس آرہے ہیں پھران تک اپنی بات پہنچانے کا کونسا طریقہ رہ جاتا ہے، ہم نے اعزاز دے کر اپنا پیغام سنانے کے لئے اپنے جلسوں میں ان کو مدعو کیا، وہ نہیں آئے، ہم نے ان تک قرآن پہنچانا چاہا، انہوں اس کو قبول نہیں کیا، ہم نے پیام حق ان کو سنانا چاہا، وہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن آپ کے ان سب دلائل کے باوجود ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ہم ان کے پاس گئے بغیر بھی ان تک اپنا پیغام پہنچاسکتے ہیں، ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام کی حقانیت ان کی نظروں سے گذار سکتے ہیں اور غیر محسوس طریقہ پر بھی اللہ کا پیغام ان کو سننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، مثلاً ایک نئی جگہ ہم دوکان لگاتے ہیں، کیا دوکان کے نہ چلنے پر دوتین ماہ کے اندر ہی اپنی دوکان بند کردیتے ہیں؟ نہیں بلکہ ہم واقعی اگر تاجر ہیں تو پہلے مرحلے میں یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے اسٹاف نااہل ہیں، پہلے اس کو تبدیل کیا جاتا ہے، پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا تو سوچتے ہیں شاید دوکان کا باہری منظر اور اندر کا فرنیچر گاہکوں کو ترغیب دلانے میں ناکام ہے، اس کو بھی تبدیل کرتے ہیں، پھر بھی گاہک نہیں آتے تو دوکان کا آئیٹم یعنی سامان ہی بدل دیتے ہیں، سال بھر کی کوششوں کے باوجود بھی جب مثبت اثرات نظر نہیں آتے تو دوکان ہی کو اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتے ہیں، ان سب کوششوں کا بھی جب اثر نظر نہیں آتا تو جدید اور نئے تشہیری اسباب اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن وہ آجاتا ہے کہ رزاق حقیقی آپ کے صبر وتحمل سے خوش ہوکر کاروبار میں اتنی ترقی سے نوازتے ہیں کہ آپ خود حیرت میں رہ جاتے ہیں۔

لیکن افسوس ہمارا یہی دماغ جو تجارت میں نت نئے تجربات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے دعوت کے میدان میں پرانے تجربات کے علاوہ کچھ نئے تجربات اور حکمت کے ساتھ اس میدان میں کچھ نئے اسباب کو اختیار کرنے کے متعلق سوچنا بھی گوارہ نہیں کرتا، اگر تجارت کی طرح ہمارا دل و دماغ بھی دعوت کے میدان میں استعمال ہونے لگے تو چند ہی سالوں میں ہمارے اس ملک کی جو فضا ہوگی وہ نہ صرف مسرت آمیز بلکہ حد سے زیادہ خوش کن ہوگی۔

برادران وطن کی نئی نسل کو جو اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے ابھی سے منصوبہ بندی کے ساتھ اسلام سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے تو صرف دس سال کے بعد اس برصغیر کی اسلام کے حق میں جو پرامن فضا ہوگی وہ تصور سے زیادہ حیرت انگیز ہوگی، اپنے اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی کے بغیر ہمیں اس ملک میں اپنے برادران وطن کی طرف سے اپنے اوپر ہونے والے ناگہانی مظالم کے باوجود اللہ تعالی کی مدد و نصرت کی امید نہیں رکھنی چاہئے، اس لئے کے انسانوں کی نظروں میں تو وہ ظالم اور ہم مظلوم ہیں؛ لیکن ان تک اسلام کی دعوت اور توحید کا پیغام نہ پہنچانے کی وجہ سے اللہ تعالی کے پاس وہ مظلوم اور ہم ظالم ہیں اور اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی تلافی کے بغیر ہم اللہ رب العزت کی مدد کے مستحق نہیں بن سکتے۔

❁❁❁❁

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار

❁❁❁❁

عظمت دین

دین اور اس کی ضرورت

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی شعبہ دینیات اے، ایم، یو، علی گڑھ

''دین'' عربی زبان ہے، جس کے معنی معاملہ کرنا ہے، عربی میں ایک مقولہ ہے ''دناھم کمادانوا'' ہم نے ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جیسا کہ انہوں نے کیا تھا، قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان الدین عنداللّٰہ الاسلام'' بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔

دین اسلام کی یا شریعت کی زبان میں اُس نظام زندگی کو کہتے ہیں جس میں مرکز اطاعت خدا کی ذات ہو، یعنی ایک انسان اس دنیا میں جو کچھ کرے وہ خود اپنے ساتھ کرے یا کسی اپنے پرائے کے ساتھ وہ سب خدا کے حکم کے ماتحت ہو، حقیقت یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی جانوروں اور چوپایوں کی طرح الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کرتا اور نہ ہی کرسکتا ہے، بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے پر فطرتاً مجبور ہے، اس بنا پر سینکڑوں، ہزاروں قسم کے معاملات ہیں جو اسے پیش آتے ہیں، اور وہ ان کے متعلق کسی ایک قطعی حکم کا خواہاں ہوتا ہے، انسانی معاشرہ کو فساد اور تباہی و بربادی سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ایک فرد کے لئے یا ایک جماعت اور گروہ کے لئے کوئی حکم ایسا ہونا چاہئے جس سے انسان کے جائز حقوق کی پامالی نہ ہو اور جس میں اس کے مفاد کو کسی دوسرے انسان کے مفاد پر قربان نہ کردیا گیا ہو۔

انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت فطرتاً ذاتی، خاندانی یا قبائلی منفعت و مفاد کو مقدم رکھتا ہے، اسی لئے ہر گاہک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کا وہ سودا کررہا ہے، وہ اس کو کم سے کم قیمت پر مل جائے، اس وقت اس کے دماغ میں پھر یہ خیال بالکل نہیں ہوتا کہ بائع کو اس صورت میں نفع ہوگا یا نقصان؟ اسی کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انسان فطرتاً مفاد پرست ہوتا ہے، اسے اپنی منفعت کے پیچھے دوسرے کے نقصان کا مطلق خیال اور اپنی لذت کوشی کی خاطر دوسرے کی اذیت کا ذرا دھیان نہیں رہتا، انسان بسا اوقات ایسی مذموم حرکت کر بیٹھتا ہے جو اسے مرتبہ انسانیت سے گرادیتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہر معاملہ اور ہر برتاؤ میں اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں: مثلاً آپ کے پاس کوئی سائل آیا ہے وہ آپ سے کسی مالی امداد کا خواہاں ہے، آپ اس وقت اچانک کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ سائل کے سوال کو پورا کردینا چاہئے یا نہیں؟ بلکہ تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگتے ہیں کہ اگر اس سائل کا سوال پورا کردیا گیا تو آپ کے پاس روپیہ پیسہ کم ہوجائے گا، پھر اس سائل کو دیکھ کر دوسرا سائل آئے گا اگر یہ سلسلہ اسی طرح دراز رہا تو اپنی ساری دولت دے کر بھی ارباب احتیاج کی حاجت و ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر انسانی معاشرہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور ایک انسان کو دوسرے انسان پر بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے سے باز رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسانی

معاشرہ ایک قانون یا دستور کا پابند ہو، پہلے زمانے میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں اور پوری مملکت میں امن وامان کے قیام کا دار ومدار ایک شخص کے اشارہ جنبش پر ہوتا تھا، آج کل دستوری وآئینی حکومت کا زمانہ ہے، عوام کے نمائندے خود ایک آئین ودستور بناتے ہیں اور پھر اپنی ایک نمائندہ حکومت قائم کرکے اس آئین کی تنفیذ کا اختیار اس حکومت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن وامان اور سکون واطمینان کا دار ومدار اس بات پر ہے کہ اس معاشرے کے تمام افراد کا ایک مرکز اطاعت ہو، پھر یہ مرکز کوئی ایک شخص ہو کہ اس کے ہاتھ میں قانون نافذ کرنے کی طاقت ہو، ان کے معاشرہ کے اطمینان وسکون اور اس کی عافیت وخوش حالی کا انحصار اس ایک قانون یا دستور یا اس معاہدہ پر ہے جس کو سب نے مان لیا ہو اور جس کی پابندی کا سب نے عہد کیا ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ واقعی ایک دستور آئین ومعاہدہ کی رسمی پابندی کا اعلان انسانی معاشرہ کو حقیقی امن وعافیت کی وہ نعمت وراحت بخش دیتا ہے جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

آج مجلس اقوام متحدہ کے ماتحت پوری دنیا ایک مشترکہ دستور کے رشتہ سے بندھی ہوئی ہے؛ لیکن اس کے باوجود پوری انسانی آبادی معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ کب یہ پہاڑ پھٹ پڑے گا اور آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہلاک وبربادی کے کس گڑھے میں گرادے گا؟ ارباب جاہ وثروت عشرت وراحت کی خود فراموشیوں میں اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کرۂ ارضی کے اوپر بسنے والے ایک ایک انسان کا دل چیر کر دیکھو اس کی تہہ میں غم واضطراب اور تشویش وفکر مندی کی دبی ہوئی لہریں ملیں گی، آج کا دن اگر خیریت سے گزر گیا تو نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن وہ اب فتوحات پر نازاں نہیں بلکہ خود پشیماں ہے کیونکہ جن چیزوں کو اس کی غفلت ونعمت کا سب سے بڑا نشان ہونا چاہئے تھا وہی اب اس کی زندگی، اس کی حیات قوی، اس کی تہذیب وتمدن اور اس کے ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہیں اور ان چیزوں کی ایجاد واختراع میں اب اس کا قدم ایک ایسی منزل میں پہنچ گیا ہے کہ وہ پیچھے بھی نہیں لوٹ سکتا، پھر یہ بھی دیکھو کہ ان سب قوموں نے جس معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ انسانی حقوق کے جس چارٹر کی متفقہ طور پر حمایت کرتا ہے اس کی دفعات کیا ہے، یہی کہ سب انسان برابر ہیں، کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی، کسی ایک انسانی گروہ کو اس کی آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی طاقت وقوت کا ناجائز استعمال کرکے دوسرے گروہ کے کلچر، تہذیب وتمدن اور اس کی قومی روایات کو پامال کرے، آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس ناکامی ونامرادی کا ایک ہی خاص سبب ہے اور وہ یہ کہ ان تمام معاہدہ کرنے والوں نے کی اپنے سے اور سب سے بالاتر ہستی کے سامنے اپنے عہد وپیمان پر قائم رہنے اور اپنے قول میں صادق اور ثابت قدم رہنے کا عہد نہیں کیا ہے، یہ سب معاہدے ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ یا دنیا کی سب قوموں کے آپس میں متفقہ معاہدے ہیں جو کسی ڈر یا خوف یا کسی منفعت ومفاد جو اس معاہدے کے لئے اصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا کسی ایک خاص قوم کے حق میں مضمحل ہوجاتا ہے، تو اس معاہدے کے شرائط ودفعات کی پابندی میں بھی خود بخود اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے، چنانچہ جو لوگ زبان سے جمہوریت اور مساوات کا نعرہ لگارہے ہیں، ان کے ہاتھوں کو دیکھو تو خون سے رنگین نظر آئیں گے، جو امن وامان اور صلح وآشتی کے لئے آج سب سے زیادہ بیقرار اور اس کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، ان کے اعمال کا

جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جنگ کی آگ بھڑکا دینا ان کے دل میں سب سے بڑی تمنا ہے۔

بہر حال عصبیت ایک چیز ہے جو بنی نوع انسانی کی وحدت میں رخنہ پیدا کرتی ہے اور جو ایک ہی نوع کے افراد کو مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے، یہ بت جن کو ان قوموں نے اپنا میر اطاعت قرار دیا ہے، خود انہیں کے ہاتھوں تراشیدہ اور انہیں کے ذہن وفکر کے آفریدہ ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کو اپنے کسی عمل پر نہ احتساب کا اندیشہ ہے اور نہ کسی فعل پر باز پرس کا خوف، مفاد پرستی ان کے عمل کا سب سے بڑا محرک، سب سے بڑا ضابطہ زندگی اور سب سے زیادہ مؤثر آئین حیات ہے، اس لئے وہ اعلی کیرکٹر اور وہ بلند کردار جو کسی اعلی ترین قدر حیات کے ساتھ وابستہ ہونے سے ہی پیدا ہوسکتا ہے، اس کی توقع ان سے کس طرح کی جاسکتی ہے، ایک شخص جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا ممکن ہے اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کا حامل ہو؛ لیکن اس کے یہ اوصاف اور یہ اخلاق اس کی اپنی ایک خاص طبیعت یا تربیت کا نتیجہ ہوں گے؟ اور ان کی بنیاد جذباتیت پر قائم ہوگی، اس کے برعکس جس شخص نے اپنے تمام جذبات وخواہشات کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے، اس کے عمل کا محرک بہ نسبت پہلے شخص کے زیادہ قومی اور مؤثر ہوگا اور یہ تو قاعدہ کلیہ ہے کہ محرک جس درجہ اور جس قوت کا ہوگا حرکت بھی اسی درجہ اور اسی قوت کی ہوگی۔

حضرت عمر کی نسبت اپنے اوپر پرائے سب کو تسلیم ہے کہ ان کو اہل ملک کی خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم خبر گیری کا کس قدر غیر معمولی اہتمام ہوتا تھا، بیرون مدینہ کے حالات وہاں سے آنے والے لوگوں میں سے ایک ایک سے کرید کرید کر پوچھتے تھے اور مدینہ کی گلیوں اور کوچوں کا گشت خود شب میں کرتے تھے، چنانچہ اسی طرح کے ایک موقع پر آپ کو کسی بچہ کی رونے کی آواز آئی، تو ماں سے جا کر کہا کہ بچے کو بہلائے کچھ دیر کے بعد پھر ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ بچہ اب بھی رو رہا ہے، آپ اس بچہ کی ماں پر خفاء ہوئے اور کہا تو بڑی بے رحم ہے، اب اس ماں نے کہا تم مجھے ڈانتے ہو، اصل بات جو ہے اس کی تمہیں خبر ہی نہیں ہے، عمر نے حکم دیا کہ جب تک بچے کا دودھ نہ چھوٹے اس کو بیت المال سے وظیفہ نہ دیا جائے اس لئے میں زبردست اس بچہ کا دودھ چھڑا رہی ہوں، جب حضرت عمر نے اس عورت کا یہ جواب سنا تو آپ بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا کمبخت عمر! تو نے نہ جانے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا؟ اور اس کے بعد فوراً اعلان کرا دیا کہ جس دن بچہ پیدا ہوا اس کا وظیفہ اسی دن سے مقرر کیا جائے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر شام کے سفر سے واپس ہو رہے تھے کہ کسی مقام پر ایک خیمہ نظر آیا، جب آپ قریب پہنچے تو وہاں ایک عورت پر نظر پڑی، آپ نے اس عورت سے معلوم کیا کہ تم کو کچھ عمر کا حال معلوم ہے؟ عورت نے کہا ہاں وہ شام سے واپس ہو رہا ہے، مگر مجھ کو تو اس سے ایک دانہ بھی نہیں ملا، آپؓ نے اس عورت سے کہا تم شام میں رہتی ہو اور وہ مدینہ میں، عمر کو اتنی دور کا حال کیونکر معلوم ہوسکتا ہے؟ اس پر عورت نے جواب دیا، اگر حال معلوم نہیں کرسکتا تو حکومت کیوں کرتا ہے؟ حضرت عمر نے یہ سنا تو بے ساختہ رو پڑے۔

عدل وانصاف اور مساوات وبرابری کے الفاظ آج ہر شخص کی زبان پر ہیں؛ لیکن کیا تاریخ عالم میں کوئی ایک واقعہ بھی اس کی نظیر میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقعہ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ آپ کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور آپ خود اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں، کیوں؟ صرف اس لئے کہ اونٹ ایک ہی تھا، آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے چلے آ رہے تھے،

اتفاق سے بیت المقدس میں جب داخلہ کا وقت آیا تو وہ آپ کے غلام کی باری کا وقت تھا۔

صحابہ کرام کی زندگیوں میں اس طرح کے واقعات استثنائی حکم نہیں رکھتے بلکہ تاریخ وسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں ہزاروں واقعات ملیں گے جن کو پڑھ کر آج کل کی دنیا میں ان کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا، صحابہ کرام تو خیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیض تعلیم وتربیت اٹھائے ہوئے تھے۔

اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں واقعات جو تاریخ کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں ان میں غور وفکر کرو اور دیکھو کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟ یہ غیر معمولی جوش عمل، یہ حسرت انگیز اخلاص وبے نفسی حکومت کے اقتدار اعلی کے باوجود یہ عاجزی وفروتنی، عقیدہ کی یہ پختگی اور کردار کی یہ بلندی یہ سب اوصاف کیا اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب کہ انسان کے معتقدات اور اس کے اعمال وافعال کا تعلق براہ راست ایک اعلی ترین قدر حیات کے ساتھ نہ ہو۔

یہی وہ یقین تھا جس کے باعث حضرت عمر باوجود اپنے تمام کمالات اور اعمال حسنہ کے بعد اوقات فرماتے تھے کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمر کی جان ہے، میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن بے مؤاخذہ چھوڑ دیا جاؤں۔

علاوہ ازیں اب ایک اور پہلو سے غور کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت اور طبیعت میں محبت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اور اس بناء پر اس کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جس کو وہ اپنی امیدوں، ارمانوں اور تمناؤں کا مرکز بنائے، اس کی یاد میں اسے لطف وسرور حاصل ہوتا ہو اور اس کے غم میں عشق کی لذت وحلاوت کے مقابلہ آسائش راحت وعشرت کی لذت وحلاوت کے مقابلہ آسائش راحت وعشرت ہر دو جہانی ہیچ نظر آتے ہوں، ایک طرف انسان کی یہ فطرت کہ وہ محبوب تلاش کرتا ہے اور دوسری جانب اس کی یہ محرومی اور بدنصیبی کہ وہ اس وسیع کار گاہ ہست وبود میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے، غرض ہر اس چیز سے جس کا اس سے دور یا نزدیک کا تعلق یا رشتہ ہوتا ہے، ہر ایک سے محبت کرتا ہے اور دل لگاتا ہے لیکن ہر انسان کی زندگی میں آخر ایک وقت آتا ہے، جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب تک اس نے جس چیز سے محبت کی تھی اس کی یہ محبت ناپائیدار تھی، اس احساس کے بعد انسان میں تنہائی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سب کچھ رکھنے کے باوجود اکیلا ہی پاتا ہے؛ لیکن جس شخص کے دل میں خدا کی محبت ہوتی ہے اور مذہب سے لگاؤ ہوتا ہے وہ کبھی کسی حالت میں اپنے تئیں تنہا محسوس نہیں کرتا، ہر حالت میں خوش مطمئن اور مگن رہتا ہے اور کبھی اس کے اندر بددلی آزردگی اور دل گرفتگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا ہے، اس پر اگر غم کا پہاڑ ٹوٹتا بھی ہے تو یہ بدحواس اور سراسیمہ نہیں ہوتا ہے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور ہے، بعض کوتاہ اندیش معلوم کرتے ہیں کہ اب بھلا مذہب کی ضرورت کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کرے انسان بہر حال کبھی مذہب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، کیونکہ حقائق اشیاء کے متعلق ہمیشہ دو اہم بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ یہ چیز کیا ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کیوں ہے؟ ان میں سے پہلے سوال کا جواب سائنس کے دائرہ اختیار وعمل میں ہے اور دوسرے کا جواب صرف اور صرف مذہب دے سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی تکمیل دونوں ہی سوالات کے جوابات پر منحصر ہے، اگر مذہب نے مدد نہ کی تو اندیشہ ہے کہ سائنس کی یہ حیرت انگیز ترقی ہی کہیں بنی نوع انسان کی عظیم اور ناقابل تلافی ہلاکت وبربادی کی باعث نہ بن جائے۔

❁❁❁

حالات حاضرہ

بھارت کی تاریخ کا نازک موڑ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، علی گڑھ

مؤرخین جب اس عہد کی تاریخ لکھیں گے تو ضرور لکھیں گے کہ یہ وقت بھارت کی تاریخ بالخصوص بھارتی مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین موڑ تھا، تقریبا ایک مہینہ گذر گیا ہے اسی کشمکش اور کسمپرسی میں، حالات انتہائی غیر متوقع ہیں، کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ کہیں ایک بار پھر ملک میں ایمرجنسی نہ نافذ کردی جائے اور کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی تیاری مکمل کی جا چکی ہے، فوجی سربراہ کی طرف سے سیاسی بیان دینا بھارت کی ستر سالہ جمہوری روایت کے خلاف ہے، مگر اس بیان کے پیچھے بڑا راز ہے، بھارتی فوج میں بری، بحری اور ہوائی افواج کے الگ الگ سربراہ ہوا کرتے تھے، تینوں آپس میں صدر جمہوریہ کی اجازت کے بغیر بات تک نہ کر سکتے تھے، مگر موجودہ حکومت نے آئینی و جمہوری اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنرل پپن راوت کو مسلح افواج کا سربراہ اعلی چیف آف ڈیفنس اسٹاف بنا دیا، سی ڈی ایس صاحب اب صدر جمہوریہ کو جوابدہ نہ ہوں گے بلکہ وہ وزیر اعظم کو جواب دہ ہوں گے، جس سے فوج کی سیاست میں مداخلت کا واضح اشارہ ملتا ہے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ فوج کو اب اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے، بی جے پی حکومت کا یہ اقدام انتہائی خطرناک منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ بات صاف ہے کہ اس طویل عرصہ میں آر ایس ایس تیاری کے تمام مراحل طے کر چکی ہے، اس کے تربیت یافتہ افراد بھارت میں طبقاتی نظام کے قیام اور اعلی ذات کے تحفظ کے لیے اہم عہدوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس وقت اس ملک کا آئین، جمہوریت، پسماندہ اقوام اور بالخصوص مسلمان ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں، وہ اس وقت تاریخ کے نازک موڑ پر ہیں اور خطرناک حالات سے گذر رہے ہیں۔

حوصلہ بخش اور خوش آئند بات یہ ہے کہ وقت رہتے عوام نے خطرے کو بھانپ لیا، تحریک آزادی کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب ایسی زوردار عوامی تحریک دیکھنے میں آئی کہ بچے بچے کی زبان پر آزادی کے نعرے مچلنے لگے، خود بخود عوام کا ایسا سیلاب سڑکوں پر آ گیا، بلا تفریق مذہب عوامی اتحاد، حب الوطنی کا جذبہ، آئین ہند کے تحفظ کی بے مثال کوشش اور فسطائیت سے نفرت ایک تحریک بن گئی، یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ یونیورسٹیز سے لے کر سڑکوں تک عام احتجاجات میں ابھر کر جو شخصیات اور جو طاقت سامنے آئی وہ عورتوں کی ہے، گویا آزادی کی اس تحریک کی موثر قیادت عورتوں نے کی، ان کی پامردی، ان کا جذبہ، ان کی گفتگو، ان کے جوابات، ان کا عزم و حوصلہ سب کے سب حوصلہ بخش رہے، آج ایک ماہ سے زیادہ مدت گذر گئی، مظاہروں میں مزید شدت آتی جا رہی ہے، شہر شہر غیر متعینہ مدت کے مظاہروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، حکومت پوری بے شرمی سے اپنے موقف پر جمی ہوئی ہے، بظاہر ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، بلکہ وزیر داخلہ نے کہا ہی تھا کہ ہم سی اے اے پر ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، راقم نے اپنے ٹوئیٹ میں جواب دیتے

ہوئے کہا تھا کہ اگر تمہارا یہ عزم ہے تو ہم بھارت کے لوگ عزم کرتے ہیں کہ بھارت کی ایک انچ زمین پر بھی اس قانون کو نافذ نہیں ہونے دیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ حکومتِ وقت تانا شاہی کے راستے پر چل پڑی تھی اور کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا تھا، بالخصوص مسلمان تو بالکل ہی غفلت کی نیند میں تھے بلکہ ڈرے سہمے ہوئے تھے، ان سے ان کی قیادت نے سپا و کانگریس کی ایسی غلامی کرائی تھی کہ کبھی انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایسے نازک حالات بھی آئیں گے، حکومت اپنے انتخابی منشور کے لحاظ سے ایک ایک کام کرتی گئی، اپوزیشن کو ختم کرتی گئی، ہندتوا کی آگ لگاتی گئی اور راشٹرواد کے نام پر غلط اور جارحانہ پالیسیاں نافذ کرتی گئی حتی کہ بات یہاں تک آ پہنچی کہ آئین کے بنیادی ڈھانچہ کو ہی خطرہ لاحق ہوگیا، منوواد اور ہندو راشٹر کی راہ ہموار کرنے والے اس خطرہ کو لوگوں نے بھانپ لیا اور متحدہ طور پر پرزور آواز بلند کی، اس تحریک کو چھیڑنے کا سہرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات کے سر بندھا، اس کو قوت فراہم کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پھر جے این یو کے طلبہ و طالبات نے، پھر جب جامعہ واے ایم یو میں پولیس نے اپنی بربریت سے تحریک کچلنے کی کوشش کی تو ملک و بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کے طلبہ سڑک پر آئے، دیوبند، ندوۃ العلماء کے باغیرت و باشعور طلبہ بھی ضبط غم نہ کر سکے، پھر اداروں میں چھٹیوں کے ذریعہ تحریک کے ختم ہونے کا امکان بڑھا تو بعض منظّم تنظیموں نے اپنے کیڈر سے کمک پہنچائی اور پھر ملک بھر کی خواتین اور بالخصوص دہلی کی خواتین نے اس مزاحمتی تحریک کو دوام و تسلسل بخشا، انھوں نے مزاحمت کا جذبہ عطا کیا، وہ اس تحریک کی روح رواں بن گئیں، اب یہ تحریک ملک گیر سطح پر پھیلتی ہی جارہی ہے، اور اس میں خواتین کا رول بڑھتا ہی جارہا ہے، بلکہ خواتین کے اس انقلابی اقدام اور سرفروشانہ کردار سے ہمیں یہ یقین ہوگیا کہ ہماری آئندہ نسلیں آزاد پیدا ہوں گی، وہ خواہ غازی ومجاہد نہ ہوں مگر ہماری طرح بزدل و مصلحت پسند اور غلامانہ ذہنیت کی حامل نہ ہوں گی، بنت حوا کو کس طرح داد دی جائے اور کیسے خراج تحسین پیش کیا جائے جس نے اپنے تن نازک کو مہینے بھر سے سرد راتوں میں سڑک پر ڈال رکھا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ان شاہین صفت ماؤں کی کوکھ سے جو نسل جنم لے گی وہ شاہین صفت بن کر دادِ شجاعت دے گی۔

یاد ہوگا کہ راقم نے پہلے ہی لکھا تھا کہ این آرسی پر واویلا مچانے کی ضرورت نہیں، اگر حکومت اپنے ناپاک منصوبے کے نفاذ کے لیے بضد ہوگی تو پھر ہم پوری قوت سے اسے مسترد کریں گے اور ہر پیمانے پر احتجاج کریں گے، یہی کچھ اس وقت ہو رہا ہے، ہر شخص اور ہر بھارتی اپنی بساط بھر اس تحریک میں شریک ہے، کوئی جسمانی قربانی دے رہا ہے کوئی مالی، کوئی زبان وقلم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خدمت کر رہا ہے تو کوئی فکری کمک پہنچا رہا ہے، صرف مفاد پرست، فریب دینے والے، مصلحت پسند، بزدل اور زنجیر و زنداں سے خائف لوگ خاموش ہیں، بلکہ بعض مصلحت کے مارے اور پرسکون زندگی کے عادی سوال کرتے ہیں کہ ان مظاہروں کا کیا فائدہ؟ ان بے چاروں کو اب تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی جو ہم نے کئی ماہ قبل بھی لکھی تھی کہ جمہوریت میں سڑک کی لڑائی ہی انانیت وانارکی اور تاناشاہی کا واحد علاج اور حل ہے، یہ حقیقت ہے کہ جمہوریت میں عوامی رجحان ہی پالیسیوں کی اصل بنیاد ہوتا ہے، مگر جب نیت خراب ہو تو عوامی رجحان سے قطع نظر حکومتیں بند کمروں میں فیصلے کر لیتی ہیں اور اکثریت کے نشہ میں چور ہوکر طاقت کے بل پر وہ فیصلے نافذ کرتی ہیں، پھر اسٹریٹ فائٹ ہی ان استبدادی قوانین اور جابرانہ

پالیسیوں کو تبدیل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، عمل سے فارغ بزدل لوگ ان مظاہروں کے فوائد کو کیا سمجھیں کہ یہ مزاحمتی مظاہرے فرعونیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، انھوں نے سال میں مکمل ہونے والے منصوبوں کو سال پیچھے ڈھکیل دیا، انھوں نے آئین کے تحفظ کے لیے اسٹریٹجی بنانے کی مہلت فراہم کی، انھوں نے عوام کو سوچنے اور سوال کرنے کا حوصلہ دیا، انھوں نے دلوں میں بیٹھ گئے خوف سے نجات دلائی، انھوں نے اکثریت رکھنے والی حکومت کو پارلیمنٹ کے ذریعہ پاس کیے گیے ایک غلط قانون کے لیے عوامی حمایت طلب کرنے پر مجبور کیا، حکومت نے حمایت میں عوامی ریلیوں کا مطالبہ کیا، مس کال کی مہم چلائی اور ملک کی تاریخ میں وہ موقع بھی آیا کہ کورٹ نے کچھ یوں تبصرہ کیا کہ بھارت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی قانون کو آئینی قرار دینے کے لیے عرضی داخل کی گئی، کورٹ نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرضی خارج کردی، ان مظاہروں کی طاقت ہے کہ اسٹیٹ مخالفت پر آمادہ ہیں، کسی نے سی اے اے کی حمایت کی مگر NRC کے خلاف ہے، کوئی دونوں کے خلاف ہے، کیرلا اور پنجاب حکومت نے اپنی اسمبلی سے اس کی غیر آئینی حیثیت کو بتانے کے لیے ریزولوشن تک پاس کردیا اور کیرلا حکومت تو سپریم کورٹ بھی پہنچ گئی، کیرلا اور بنگال حکومت نے NPR کے حکم نامہ پر اب تک عمل نہیں کیا ہے، یہ سب کچھ آئین ہند کے دائرے میں ہوا اور ہو رہا ہے، اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ان مظاہروں کے نتیجہ میں ہو رہا ہے، ابھی کل ہی وزیر داخلہ کا بیان آیا ہے کہ NPR کے اضافی سوالات میں سے تین سوال کم کردئے گئے ہیں کون سے کم کیے گئے یہ ابھی مبہم ہے کوئی کاغذ نہیں مانگا جائے گا اور نہ ہی بائیومیٹرک ڈاٹا لیا جائے گا، اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی کچھ اور محنت اور قربانی کی ضرورت ہے،

یہ ان مظاہروں کی طاقت ہے جو وزیر داخلہ کو جگہ جگہ ریلیاں کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے، یہ مظاہرے ہی ہیں جن کے سبب بھاگوت نے اپنے بیان میں کہا کہ بھارت میں صرف آئین کی حکمرانی ہے، ہم اسی آئین کو مانتے ہیں جو اس وقت لکھا گیا جب ہمارا وجود نہ تھا، اگر کوئی ایسا کام ہوا جو اس آئین کے خلاف ہو تو ہم اس کی مخالفت کریں گے، سوچئے ذرا جنھوں نے سال میں کبھی ترنگا نہ لہرایا اور ہمیشہ آئین کی مخالفت کرتے رہے وہ آج آئین کی حکمرانی کا اعتراف کررہے ہیں، اس پر کس نے مجبور کیا؟ ان مظاہروں نے مسلم قوم کو ایک نئی زندگی دی ہے، انھیں خود ان کی قیادت نے اپنے مفادات میں استعمال کرکے ناکارہ بنا دیا تھا، انھیں ان کی حیثیت سے بھی غافل کردیا تھا، مگر وقت نے انگڑائی لی تو آج یہی قوم آزادی کے بعد کی سب سے اہم، سب سے طویل اور سب سے خطرناک جنگ کی قیادت کررہی ہے، ان مظاہروں نے بہت واضح پیغام دیا ہے کہ مسلمانوں کو نہ ڈرایا جاسکتا ہے اور نہ ان کو دبانا ممکن ہے، وہ اپنے پورے تشخص کے ساتھ یہیں رہیں گے، یہیں مریں گے اور اسی مٹی میں دفن ہوں گے۔

بعض عقل کے مارے سوال کرتے ہیں کہ اگر حکومت پیچھے نہ ہٹی تو کیا ہوگا؟ ان کو سمجھنا چاہیے کہ کوئی جنگ اگر مگر کی پالیسی کے ساتھ نہیں لڑی جاتی بلکہ یہ سوچ کر لڑی جاتی ہے کہ فتح ہماری ہی ہوگی، پھر اسی کے لیے ساری تگ و دو ہوتی ہے اور سارے منصوبے بنائے جاتے ہیں، یوں بھی قرآن مجید کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر ظلم کی ایک انتہا ہے، ہر فرعون کے لیے زوال مقدر ہے، ہر استبداد کو بالاخر شکست ہونی ہے، شرط یہ ہے کہ خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو، تسلسل کے ساتھ مزاحمت کی جائے اور ظالم کے ظلم کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنا فرض منصبی ادا کیا جائے، لیکن جب قبلہ درست نہ ہو، ترجیحات کا

صحیح تعین نہ ہو، غلامانہ فکر نے پنجے گاڑ دیے ہوں، منفیت دامن گیر ہوگئی ہو، محدودیت مقدر بن گئی ہو، قرآن محض سامان برکت بن کر رہ گیا ہو تو پھر ایسے ہی مایوسی ہوتی ہے اور اسی طرح کے سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ابھی لب کھولنے کی آزادی ہے، آوازیں دبانے کی مہم کے دوران اچانک نوجوانوں نے آواز بلند کرنے کی طاقت ورتحریک چھیڑ دی ہے، اس وقت اگر یہ تحریک بے نتیجہ ختم ہوگئی، ہماری مصلحت کوشیوں کا شکار ہوگئی، ہماری ذہنی پستیوں، محدود ذہنیت یا قیادت کی ہوس کا شکار ہوگئی، تو فسطائیت کا سینہ مزید چوڑا ہو جائے گا، وہ کھلے عام دندنائے گی، ظلم کا ننگا ناچ ناچے گی، اس کے منصوبے کی تکمیل بہت آسان ہوگی، ابھی سیکولر آئین کالعدم نہیں ہوا ہے، ابھی سیکولرزم کے سہارے آپ آئینی مزاحمت کے ذریعہ اپنی بات منوا سکتے ہیں، ابھی موقع ہے کہ تمام طرح کے مفادات واختلافات سے بالا ہو کر صرف آئین کی اس لڑائی کو کسی مثبت نتیجہ تک پہنچانے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں جن لوگوں نے بھی جس سطح پر بھی کوششیں کیں وہ سب لائق مبارکباد اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، طلبہ ہوں یا اساتذہ عوام ہوں یا خواص سب کو مل کر ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے اس تحریک کو مضبوط کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور ہمارا ملی وقومی فریضہ ہے، اگر خود مظاہرہ کی ہمت نہیں یا بوجوہ مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں تو کم از کم مظاہرین کی ہر ممکن مدد کیجئے اور کم از کم انھیں اس نظر سے مت دیکھئے جس نظر سے مجرموں کو دیکھا جاتا ہے، بلکہ ان کی جرات وعظمت کو سلام کیجئے کیونکہ انھوں نے مجاہدین آزادی کے نقش قدم پر ایک قدم بڑھایا اور بالفاظ دیگر آزادی کی اس دوسری لڑائی میں اپنا حصہ ڈالا۔

ابتدا میں ہی یہ احساس ہوا تھا کہ تمام کوششوں کو منظم ومتحد کرنا بہت ضروری ہے تاکہ یہ کوششیں موثر ہوسکیں، مختلف جگہوں پر لکھا اور مختلف لوگوں سے اظہار کیا، بالآخر دسمبر کو ملک بھر کی درجنوں تنظیموں نے مل کر ایک دقاق بنالیا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک متحدہ پالیسی طے کی جائے اور تمام تنظیمیں اپنے اپنے طور پر اس کا نفاذ کریں، یہ وفاق اس لڑائی میں بھارتی قوم کی نمائندگی کرے، لیکن صد افسوس کہ مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ لوگ ہر گلی کوچہ میں الگ الگ محاذ و وفاق بنانے لگے، خودستائی اور اپنی سربراہی کی لت نے اس امت کے ہر اتحاد کو ہمیشہ پارہ پارہ کیا ہے، ایسے نازک حالات میں بھی عدم برداشت اور قیادت کی ہوس اور کریڈٹ خوری کی لڑائی کا مشاہدہ انتہائی تکلیف دہ ہے، بلکہ یہ صورت حال بذات خود ہماری لڑائی کو کمزور کرنے میں مددگار اور دشمن کے لیے معاون ہے، اگر سب کا مقصد ایک ہے تو ایک ہی وفاق کی پالیسیوں کا حصہ بننے میں کیا دشواری ہے؟ مگر نہیں ہم وہ مریض ہیں کہ مرض کسی حال میں پیچھا نہیں چھوڑتا، ابھی تو ضرورت تھی کہ اتحاد کو مزید قوت دی جاتی، یاد رکھیے کہ ہندوؤں کی شرکت کے بلند بانگ دعوے خلاف واقعہ ہیں، سکھ لڑنے مرنے کو تیار ہیں، یہ دعوی حقیقت سے پرے اور مبالغہ آرائی کی مضحکہ خیز مثال ہے، حقیقت اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ دلتوں اور سکھوں کی ایک تعداد بھی اس تحریک کا علامتی حصہ ہیں، جس پر یہ واضح ہے کہ آگے کیا ہونا ہے، عام اور نچلا دلت طبقہ تو ابھی مودی کے ہندتوا کے نشہ میں چور ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ اب اس قانون کے ذریعہ مسلمان اپنی جائیدادوں سے بے دخل کیے جائیں گے اور وہ سب ہمیں مل جائے گی، خود اس کو یہ سمجھانا اس وقت اہم کام ہے کہ اس قانون کی زد ان پر کتنی اور کس طرح پڑنے والی ہے، دراصل کمیونسٹوں کے نام عام طور پر ہندوؤں والے ہیں، اس لیے لگتا ہے کہ ہندو بڑی تعداد میں ہمارے ساتھ

ہیں، جبکہ لیفٹ کا بھی ایک طبقہ باوجود مزاحمت کار ہونے کے ہمارے ساتھ متحد ہونے کو تیار نہیں کیونکہ وہ کسی یعنی کسی تشخص کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا، اس لیے بغیر کسی خوش فہمی اور مبالغہ آرائی کے زمینی سطح پر مخلصانہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انقلاب کی یہ آہٹ واقعی انقلاب کی صبح روشن میں تبدیل ہو سکے، اس سلسلہ میں سب سے اہم اقدام یہ ہے کہ نچلے اور پچھڑے غیر مسلم طبقات کو اس حکومتی ظلم کے مضمرات سے آگاہ کیا جائے اور ان کے جو جوگ ہمارے ساتھ اسپیچ شیئر کرتے ہیں انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اس مزاحمتی تحریک میں اپنے لوگوں کو شریک کریں۔

نوجوان اور خواتین میدان میں ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ راقم نے دوبارہ بی جے پی سرکار بننے کے فوراً بعد لکھا تھا کہ اب بولنا بہت مشکل ہے مگر بہت ضروری بھی ہے؛ لیکن اب وہی لوگ بول سکیں گے جو باہمت ہوں گے، صاحب عزیمت ہوں گے، یا بے داغ ہوں گے، باقی بہت سارے لوگ اب سرکاری زبان بولیں گے یا خاموش رہیں گے، خاموش رہنے والوں میں کچھ وہ ہوں گے جو مجبوراً خاموش رہیں گے یا انھیں خاموش کر دیا جائے گا اور کچھ وہ ہوں گے جو اختیاری طور پر مصلحتاً منظرنامہ سے غائب رہیں گے، بہرحال اب جو بول رہے ہیں ان ہی کو مستقبل کا قائد سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں، ان میں سب کے سب قابل اعتبار بھی نہیں، قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ حقیقی صورتِ حال کیا ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے بلکہ مستقبل کے لیے اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس مزاحمتی تحریک سے منتخب افراد کی ایک جماعت تشکیل پائے جو مستقبل میں قومی وملی سطح پر موثر قیادت کر سکے اور خود اس مزاحمتی تحریک کو انجام تک پہنچا سکے، کیونکہ اب سالہا سال تک حالات اسی طرح غیر متوقع رہنے کی امید ہے، یہ لڑائی اب کھل کر ہونے والی ہے اور طویل مدت تک چلنے والی ہے، دہلی و بنگال کے انتخابی نتائج مزید رخ طے کر دیں گے، بی جے پی کی فتح وشکست بہر دو صورت صورتِ حال کے بگڑنے کے مزید امکانات ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر قیادت کے طلب گار لوگوں سے بچتے ہوئے کانٹوں سے الجھنے کی ہمت رکھنے والے سامنے آئیں اور پورے ملک کا دورہ کر کے ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھیں، عوامی بیداری کی یہ لہر اگر یوں ہی گذر گئی تو پھر کئی دہائیوں تک اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی۔

فوری طور پر ضرورت ہے کہ مختلف شہروں میں جو مظاہرے جاری ہیں ان کو اپنے اپنے مقام پر ہلکی پھلکی کوششوں سے ہی کمک پہنچائی جائے، سیاسی شعور پیدا کرنے کی محنت کی جائے، لوگوں کو NPR کے بائیکاٹ پر آمادہ کیا جائے، انھیں بتایا جائے کہ وزیر داخلہ صاف کہہ چکے ہیں کہ NPR خود ہی NRC کی طرف پہلا قدم ہے، اس میں اضافی سوالات دراصل NRC کی بنیاد ہیں، اس کا واحد حل بائیکاٹ ہے، جمہوری لڑائی میں آخری ہتھیار سول نافرمانی ہے، مختلف اقوام و مذاہب پر مشتمل محاذ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ NPR کا بائیکاٹ کیا جائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص جگہ جگہ اپنی بساط بھر گھر گھر جا کر لوگوں کو خطرات سے آگاہ کرے، ہر گلی نکڑ پر میٹنگیں اور پروگرام کرے، آئین کے تحفظ کے لیے غیر مسلموں کو آمادہ کرے، حکمت کا کامیاب تجربہ کرے، احتجاج کے نئے نئے طریقوں کا تجربہ کرے، مثلاً ہر شخص اپنے محلّہ میں مشورہ کرے کی ہم کو بائیکاٹ کرنا ہے اس کے اعلان کرنے کے لیے پورے محلے میں بائیکاٹ کے بینر لگا دیے جائیں، کسی دن سارے لوگ ایسا لباس پہنیں جس پر No NPR لکھا ہو، اس طرح خاموش احتجاج کے بہت سے طریقے اپنائے جا سکتے ہیں، جن کے ذریعہ مزاحمتی تحریک کو

کامیاب اور موثر بنایا جاسکتا ہے، یاد رکھیے کہ مرکزی حکومت گزٹ نوٹیفکیشن کرچکی ہے، ہمارے پاس صرف یکم اپریل سے پہلے تک کا وقت ہے، ہمیں اس سے پہلے گاؤں گاؤں اور گھر گھر اس تحریک کو پہنچانا ہے کہ NPR کا بائیکاٹ کیا جائے، کیونکہ اس کی بنیاد پر ادنی درجہ کے آفیسر کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہے مشکوک شہری قرار دے دے، ایک بار وہ مشکوک شہری قرار دے دے گا پھر آپ ثابت کرتے پھریں گے اپنی شہریت، اس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے والدین کا دینا ہوگا جو شاید ہی کچھ لوگ دے سکیں، بہرحال مشکلات بہت ہیں، مستقبل میں مسائل مزید پیدا ہونے کے امکانات ہیں، حل صرف ایک ہے کہ مخلصانہ طور پر مزاحمت کی جائے، اللہ پر بھروسہ رکھا جائے، رجوع الی اللہ کو ہتھیار بنایا جائے، متحدہ کوششوں پر لبیک کہا جائے، اور یہ طے کرلیا جائے کہ ہمیں اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے کوئی کاغذ نہیں دکھانا ہے، یہ الگ بات ہے کہ نارمل حالات میں بھی تمام ضروری کاغذات اپنے پاس رکھنا ہی دانشمندی ہے، بلکہ جو کاغذ دیکھنے آئے اس سے پوچھنا ہے کہ تم بھارتی ہو یا گھس پیٹھیا؟ یقیناً وہ جواب دے گا کہ وہ بھارتی ہے، پھر اس سے بھارتی ہونے کا ثبوت مانگا جائے، جو وہ بالیقین نہیں دے سکے گا کیونکہ حکومت کے مطابق پاسپورٹ، آدھار کارڈ، راشن کارڈ، پین کارڈ اور جاب آئی ڈی اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ شہریت کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے اسے اپنا اور اپنے والدین کا برتھ سرٹیفکیٹ دکھانا ہوگا، جب وہ نہ دکھا پائے تو اس سے کہیے کہ حکومت کی زبان میں آپ گھس پیٹھئے قرار پائے اس لیے آپ کو دوسروں سے کوئی کاغذ مانگنے کا حق نہیں، اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ NPR, NRC, CAA سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جنھیں جوڑ کر دیکھنا ہو تو ہٹلر کی تاریخ پڑھ لیجئے سب واضح ہوجائے گا، اس وقت حکومت سب کچھ اسی ترتیب پر اس طرح کررہی ہے جس طرح ہٹلر نے کیا تھا، ہم نے الگ الگ ان تینوں چیزوں کی تفصیل نہیں لکھی ہے، کیونکہ سوشل میڈیا کے دور میں یہ تمام تفصیلات تقریباً سب تک پہنچ رہی ہیں، بس چند ضروری چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، دشمن نے اگر وقت سے پہلے آپ کو بیدار کردیا ہے تو اس کا شکریہ ادا کیجئے، بیداری سے فائدہ اٹھائیے یہی وقت کی ضرورت ہے بلکہ اس وقت کی اہم عبادت ہے۔

❁❁❁❁

وہ شخص جھوٹا تھا لیکن سچ بات کہہ گیا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صدقہ فطر کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا، اس دوران ایک شخص آیا اور اس میں سے اپنا لپ بھرا اور چوری کر کے لے جانے لگا، میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: ''تمہیں اللہ کے رسولؐ کے پاس لے جاؤں گا، اس نے کہا مجھے چھوڑ دیجئے، میں بال بچوں والا محتاج شخص ہوں، میں نے مجبوری کی وجہ سے ایسا ہے، اس کی اس بات پر رحم کھا کر میں نے اس کو چھوڑ دیا''۔

دوسرے دن وہ پھر آیا اور وہی حرکت کرنے لگا اور وہی عذر پھر پیش کرنے لگا، بالآخر اس کی اس معذرت پر میں نے پھر اس کو چھوڑ دیا، لیکن جب تیسرے دن آ کر پھر یہی حرکت کرنے لگا اور معذرت بھی کرنے لگا، تو میں نے کہا اس مرتبہ تو تم کو اللہ کے رسولؐ کے پاس ضرور لے جاؤں گا، اس پر اس نے کہا مجھے چھوڑ دو، میں تم کو فائدہ کا ایک عمل بتاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب تم سونے کے لئے اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی پڑھو، اس کا اثر یہ ہوگا کہ صبح تک اللہ تعالی کی طرف سے تمہارے قریب ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہوگا اور شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا، جب رات کا یہ قصہ میں نے دوسرے دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ نے فرمایا وہ شخص تو جھوٹا تھا لیکن بات سچ کہہ گیا، وہ دراصل شیطان تھا۔ (مجالس نبوی صفحہ ۸۱)

یادرفتگاں

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلویؒ کی
راقم پر شفقتیں اور محبتیں

حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی قدس سرہ کا نام نامی اسم گرامی دارالعلوم دیوبند میں داخل ہونے کے بعد ہی سن لیا تھا کہ سہارنپور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا محمد طلحہ صاحب ہیں جو اپنے والد ماجد کی یادگار بنے ہوئے ہیں اور خانقاہ خلیلیہ (کچے گھر) میں رہتے ہیں، دیوبند کی طالب علمی کے زمانے تک ملاقات اور دیدار سے محروم رہا، البتہ فراغت کے بعد ملازمت کی غرض سے جب مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفرآباد میں مقیم ہوا تبھی سے ان سے ملاقات اور دیدار کا موقع ملتا رہتا تھا؛ لیکن قربت اور بات چیت کا موقع کبھی نہیں ملا، جب بھی سہارنپور جانا ہوتا تو ان کی مجلس میں ضرور حاضری دیتا اور عام لوگوں کی طرح سلام ومصافحہ کرکے واپس آجاتا۔

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی سے راقم کا تعلق اور قربت اس وقت ہوئی جب حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا مہتمم معہد الرشید الاسلامی چیپاٹا، زامبیا (افریقہ) سے ملاقات کی غرض سے سہارنپور جانا ہوا، وہ اس طرح کہ ایک روز مرکز احیاء الفکر الاسلامی کے رئیس مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی مدظلہ العالی نے راقم سے فرمایا کہ سہارنپور جانا ہے مہمان آئے ہوئے ہیں ان سے ملنا ہے، چنانچہ راقم ۱۹/مئی ۲۰۱۱ کو مرکز سے کچھ کتابیں اور پھل وغیرہ لیکر کچے گھر پر حاضر ہوا، عصر کے بعد کا وقت تھا، تعلیم ہو رہی تھی، حاضرین کا ایک کثیر مجمع تھا، راقم بھی مجلس میں بیٹھ گیا، اتنے میں مولانا عابد حسین صاحب ندوی نے اشارہ کرکے کہا کہ مہمان اُس کمرے میں ہیں، وہاں چلے جاؤ، میں اٹھ کر جب چلنے لگا تو مولانا محمد طلحہ صاحب کو محسوس ہو گیا کہ کوئی کمرے میں گیا ہے، چنانچہ مجلس سے اٹھ کر فوراً کمرے میں آگئے اور کہنے لگے کہ کیا بات ہے، تم کون ہو؟ اتنا کہنا ہی تھا کہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا مجھے لیکر مجلس میں آگئے اور مولانا طلحہ صاحب بھی آگئے، جب تعلیم ختم ہوئی تو راقم کو ڈانٹنے لگے اور کہنے لگے کہ تم ہماری اجازت کے بغیر کیسے اندر چلے گئے تھے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے یہاں کے اصول وضوابط کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، مجھے مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی صاحب نے بھیجا ہے اور کہا کہ سہارنپور جاکر حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا سے ملاقات کرکے مرکز میں آنے کی دعوت دے آؤ، اس لئے راقم حاضر ہوا ہے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد راقم ''نقوش اسلام'' اور کچھ نئی کتابیں لیکر حاضر ہوا، مجلس کے اختتام پر سلام ومصافحہ کیا، کتابیں اور رسالہ پیش کیا، انہوں نے فوراً پہچان لیا اور قریب بٹھالیا، خیر خیریت معلوم کی اور شفقت فرمائی، نیز یہ بھی کہا کہ کھانا یہیں پر کھانا، بندہ عشاء کی اذان کے بعد پہنچ گیا، کھانا کھایا اور رخصت ہونے کی اجازت چاہی، اس پر پیر صاحب نے کہا کہ کب جاؤ گے، میں نے کہا کہ صبح سویرے نکل جاؤں گا، پھر حضرت نے اپنی جیب سے ۱۰۰/روپیہ نکال کر ہدیہ میں پیش کیا، راقم خوشی خوشی وہاں سے واپس آگیا۔

اس کے بعد سے حضرت مولانا طلحہ صاحب کاندھلویؒ راقم کے اوپر شفقت ومحبت فرمانے لگے، جب بھی مرکز سے کوئی کتاب چھپتی تو راقم ان کو ضرور پیش کرتا، کبھی کبھی یہ بھی کہتے کہ اس کتاب کے اتنے نسخے بھیجوادو، بہرحال ان کی خواہش کے مطابق کتابیں ان کے پاس بھیجوادی جاتی تھیں، یا راقم خود لیکر حاضر ہوجاتا، بہرحال جب بھی حضرت کے پاس جاتا تو کہتے رسالہ نقوش اسلام کہاں ہے؟ اورکونسی کتاب منظر عام پر آئی ہے، راقم اپنے بیگ سے رسالہ نکال کر دیتا تو فوراً رسالہ ہی کو مجلس میں پڑھوانا شروع کردیتے، خاص طور سے رسالہ کے اداریہ کو ضرور پڑھواتے اور واپسی پر ہدیہ بھی دیتے، شفقت ومحبت کا یہ سلسلہ آخری دنوں تک جاری رہا۔

۹؍دسمبر ۲۰۱۲ء کو جب حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا کا انتقال ہوگیا، تو مرکز کے رئیس مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی نے مولانا مرحوم کی شخصیت پر رسالہ کا نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا، جس کے سلسلہ میں راقم کو کہا کہ سہارنپور جاکر مولانا طلحہ صاحب سے مضمون لکھوا کر لے آؤ، چنانچہ راقم سہارنپور گیا اور حضرت پیر صاحب سے مضمون لکھنے کے متعلق درخواست کی، چنانچہ راقم نے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا کے متعلق چند سوالات کئے، جن کے جوابات حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی دیئے تھے، جن کو یہاں نقل کیا جارہا ہے:

سوال: آپ کی مولانا عبدالرحیم صاحب متالا سے کب ملاقات ہوئی؟۔

جواب: میری ان سے سب سے پہلی ملاقات مدرسہ قدیم میں اس وقت ہوئی جب میں مسجد سے باہر آرہا تھا تو انہوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا کہ میں گجرات سے آیا ہوں، غرضیکہ انہوں نے نیازمندانہ سلام ومصافحہ کیا تھا۔

سوال: آپ نے ان کی دعوت پر کتنی دفعہ زامبیا کا سفر کیا؟

جواب: میں کتنی باران کی دعوت پر زامبیا گیا ہوں یہ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔

سوال: آپ کے ساتھ وہ کس طرح پیش آتے تھے؟

جواب: ویسے وہ میرے ساتھ ایسے ہی پیش آتے تھے جیسا کہ وہ میرے والد (حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ) کے ساتھ پیش آتے تھے، مولانا عبدالرحیم متالا نوراللہ مرقدہ حضرت والد صاحب کے بہت لاڈلے خادم تھے، والد صاحب کو ان سے بہت انس تھا۔

سوال: ان کی وفات پر آپ کا کیا تأثر ہے؟

جواب: حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب امام بھی تھے، پیر بھی تھے اور ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے تھے، مولانا افتخار صاحب کاندھلویؒ نے فون پر بتایا کہ ان کے انتقال کی جب خبر معلوم ہوئی تو موٹے موٹے آنسو نکل آئے کہ ہمارا خاص آدمی دنیا سے رخصت ہوگیا، مولانا متالا ایک آدمی ہی نہیں بلکہ وہ کئی آدمیوں کی خصوصیات کا مجموعہ تھے۔

سوال: ان کی زندگی میں آپ نے کیا خاص بات محسوس کی؟

جواب: وہ بہت ملنسار، جوڑ رکھنے والے تھے، معمولات کے پابند تھے، تبلیغ تصنیف وتالیف اور تعلیم غرضیکہ تینوں سے ان کا جوڑ تھا۔

سوال: ان کی زندگی سے آپ لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟۔

جواب: انہوں نے جیسی زندگی گزاری ہے وہ بڑی محتاط زندگی تھی، ان کے تعلقات بہت تھے، ان کا تعلق تبلیغ والوں سے، مدرسہ والوں سے اور سلوک والوں سے تھا، ایسی جامعیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے، ان کے مدرسہ سے جو لوگ جڑے ہوئے

ہیں، خاص طور سے جوان کے مدرسہ کی امداد کرتے ہیں، وہ اب بھی ان کے مدرسہ کی ضرورت میں بھرپور تعاون کریں۔

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے اے رضواں!
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی ایک متقی، پرہیزگار اور دیندار انسان تھے، ہمہ وقت ذاکر وشاغل اور یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے، آپ درویش صفت اور دور اندیش انسان تھے، آپ کی گفتگو پر لطف ہوتی تھی، آپ کا انداز تکلم سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا، منکرات سے انہیں سخت نفرت تھی، انگریزی بال اور انگریزی لباس سے انہیں بہت کڑھن ہوتی تھی، خاص طور سے داڑھی نہ رکھنے والوں سے بہت خفا ہوتے، بعض دفعہ غصے میں آ کر تھپڑ بھی رسید کر دیتے اور کہتے کہ کیا تمہیں نبی کی شکل اچھی نہیں لگتی، قبر میں کیا منہ دکھاؤ گے، پیر صاحب داڑھی کے متعلق جس شخص کی سرزنش کرتے تو اس کو اپنی طرف سے ''داڑھی کا وجوب'' نامی رسالہ بھی بطور ہدیہ پیش فرماتے اور کہتے کہ اس کو غور سے پڑھ لینا۔

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی کو تبلیغی جماعت سے خاص مناسبت تھی، اپنی مجلس میں تبلیغی جماعت کی قدر و منزلت اور اس کی اہمیت کے بارے میں گفتگو کرتے، ایک دفعہ راقم کی موجودگی میں چند جماعتی حضرات کو سمجھا رہے تھے کہ تبلیغ کیلئے دو چیزیں شرط ہیں، ایک تعلیم کا ہونا دوسرے ذکر کا کرنا، اگر کسی کے پاس تعلیم نہیں تو اسے تبلیغ میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں، ایسے ہی اگر کوئی ذکر نہیں کرتا تو اس کو بھی تبلیغ میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں، چونکہ یہ ایسا ہے کہ جیسا کسی کبوتر کے پر کاٹ دیئے جائیں، اب اس کبوتر کو یہ خطرہ ہے کہ اس کو بلی پکڑ لے گی یا اس کو اوپر سے کوئی چیل کوا وغیرہ اچک لے گا، آج کل تبلیغی جماعت میں جو برائیاں در آئی ہیں یہ سب اسی کا نتیجہ ہے، چونکہ عام طور سے جہلاء حضرات تبلیغ میں جاتے ہیں اور شیطان کے شکار ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ علماء کی ناقدری کرتے ہیں جو آئے دن دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔

مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی خانقاہ خلیلیہ کو سجائے ہوئے تھے اور اپنے والد کی یاد کو تازہ کئے ہوئے تھے، صبح وشام کے معمولات پابندی سے ہو رہے تھے، کچھ گھر پروار دین اور صادرین کا ایک مجمع رہتا تھا، ان کے یہاں آنے والوں کے لئے کھانے کا بندوبست رہتا، مہمان نوازی اور دادرسی انہیں اپنے والد محترم شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی سے وراثت میں ملی تھی، وہ مہمان کے مزاج کے مطابق کھانے کا اہتمام کرواتے اور رخصت کرتے، بہر حال پیر صاحب کی اور بہت سی خصوصیتیں ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا کو غریق رحمت کرے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ایک عالم دین کی وفات

۵ر دسمبر ۲۰۱۹ء مطابق ۷ر ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ بروز جمعرات حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، مفتی صاحب دیوبند کے اس خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی دینی وعلمی خدمات سے مستفیض کیا۔

حضرت مفتی صاحب کی ذات والا صفات میں بھی اپنے خاندانی بزرگوں کا عکس جھلکتا تھا، آپ نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک دین وملت کی خدمت انجام دی، ماہنامہ ''دارالسلام'' بھی آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، جس میں آپکی وسعت معلومات کا ادراک ہوتا تھا، رب قدیر ان کی بال بال مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، اعلیٰ علیین میں مقام رفیع نصیب فرمائے۔

دعوت اصلاح

زندگی کے مسائل ومشکلات اوران کا حل

محمد مسعودعزیزی ندوی

یہ مضمون دراصل راقم کا ایک بیان ہے، جو۹/ مارچ ۲۰۱۲ء بروز جمعہ مرکز کی جامع مسجد میں نمازیوں کے سامنے ہوا، اس کی افادیت کے پیش نظر قارئین کی نذر کیا جارہا ہے۔

میرے دینی بھائیو! آج ہم زندگی کے اندر، دنیا کے اندر بہت سے مسائل اور مشکلات سے دوچار ہیں، بہت سی بیماریاں لاحق ہیں، بہت سی پریشانیاں سامنے ہیں، ہر ایک آدمی کی اپنی زندگی کے اندر، اپنی سوسائٹی، اپنے معاشرہ، اپنے کاروبار، کھیتی باڑی اور اپنی بزنس کے اندر کچھ نہ کچھ مشکلات ہیں، پریشانیاں ہیں اور ایک عام آدمی کی زندگی بھی پریشانیوں سے خالی نہیں ہے، ہر ایک آدمی کچھ نہ کچھ الجھنوں کا شکار ہے، ہر آدمی کو کچھ نہ کچھ مسائل درپیش ہیں، یہ کیا وجہ ہے؟ لوگ ہر چیز پر غور کرتے ہیں، ہر چیز کے سلسلہ میں سوچتے ہیں، کوئی بھی بات پیش آجائے تو اس کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں، غور کرتے ہیں؛ لیکن عام مسلمان کی زندگی میں، عام مسلمان کے معاشرہ میں جو باتیں پیش آرہی ہیں، ان کو اپنوں کی طرف سے بھی شکایات ہیں، غیروں کی طرف سے بھی شکایات ہیں، یہ کیا وجہ ہے؟ دراصل ان تمام چیزوں کے پیچھے ہمارے اعمال، ہمارے کرتوت اور ہماری شب وروز کی جو زندگی ہے، اس کا اثر ان اعمال وکردار کے پیچھے ہے، تو ہمیں غور کرنا ہے کہ ہمارے معاشرے میں، ہماری سوسائٹی میں کیا بات ایسی پیش آرہی ہے، جس کی وجہ سے ہماری زندگی کے اندر یہ چیزیں لاحق ہورہی ہیں اور تمام مسلمانوں کو اور بلکہ دنیا کے بہت سے لوگوں کو یہ چیزیں پیش آرہی ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث کے اندر ارشاد فرمایا: "تركت فيكم أمرين لن تضلوا ماتمسكتم بهما كتاب الله و سنتي" میں تمہارے درمیان میں دو چیزیں ایسی چھوڑ کر جارہا ہوں کہ اگر تم نے ان کو مضبوطی سے تھامے رکھا، تم نے ان کو پکڑے رکھا، اپنی زندگی کو ان کے مطابق ڈھال کے رکھا، اپنی زندگی کو ان کی تعلیمات کے مطابق چلا کے رکھا تو تم گمراہ نہیں ہوں گے، تمہیں پریشانیاں لاحق نہیں ہوں گی اور زندگی کے مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے گا، وہ کیا ہیں؟ وہ اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے، حدیث نبوی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

ہم ہر واقعہ کے پیچھے اگر غور کریں اور اپنی زندگی کے ہر گوشہ پر سوچیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے اندر اور ہمارے اس عمل کے اندر کوتاہی ہے، قرآن کریم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سب پریشانیاں آرہی ہیں، ہم سب کچھ کررہے ہیں، زندگی کے سب معاملات کررہے ہیں؛ لیکن ہمارا تعلق آسمانی کتاب سے نہیں ہے، ہمارا تعلق قرآن کریم سے نہیں، قرآن کریم ہمارے گھر میں موجود ہے، مگر ہم پڑھتے نہیں، اگر پڑھتے ہیں تو اس کے اندر کیا لکھا ہوا ہے، وہ ہم کو معلوم نہیں، صرف طاقوں میں سجایا ہوا ہے، اچھا سا جزدان ہے، کبھی کبھار اٹھا کے اس کو خوشبو بھی لگادیتے ہیں، مگر اونچا رکھا ہوا ہے، ایک صاحب نے ہمیں لطیفہ سنایا، انہوں نے کہا کہ انگریزوں نے

چال چلی تھی کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ قرآن مقدس کتاب ہے، اونچی کتاب ہے، اس کو اوپر سجا کے رکھنا، اس کو اتنے اوپر رکھنا کہ اس کی بے ادبی نہ ہونے پائے، واقعی اب وہ رکھ تو دیا ایسے ہی بہت اونچا کہ کوئی پڑھتا ہی نہیں، ہر گھر میں جزدان کے اندر اوپر رکھا ہوا ہے، اس پر تو عمل ہو رہا ہے کہ قرآن اونچا رکھا ہوا ہے، مگر اس میں کیا ہے، اس کے اندر کیا پیغام ہے، یہ کسی مسلمان کو پتہ نہیں ہے، ایک اسکول میں استاذ نے طلبہ سے کہا کہ ہمارے اسکول میں لائبریری بن رہی ہے، اس میں کتابوں کی ضرورت ہے، تمہارے گھروں میں جو کتابیں زیادہ ہوں، جن کو کوئی نہ پڑھتا ہو، وہ سب کل اسکول لیکر آنا، اگلے دن جب استاذ نے کتابیں دیکھنی شروع کیں کہ کون کون سی کتابیں لائے ہیں، تو ہر ایک نے قرآن مجید دیا کہ یہ زائد کتاب ہے، اس کو ہمارے گھر میں کوئی نہیں پڑھتا، یہ واقعہ لطیفہ ہے یا حقیقت، خدا جانے، مگر اتنا معلوم ہی ہوتا ہے کہ تلاوت کا معمول اکثر گھروں سے ختم ہو گیا، تو ظاہر ہے جب قرآن نہیں پڑھا جائے گا، تو کیسے معلوم ہوگا کہ اس میں کیا ہے، اور پھر کیسے عمل ہوگا، تو دراصل اس میں کوتاہی کی بنا پر یہ سب پریشانیاں ہیں کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے، یہ ہم کو معلوم نہیں اور اس کی فکر بھی نہیں ہے، ورنہ ہونا یہ چاہئے کہ ہر محلّہ میں اور ہر گاؤں میں اور ہر قصبہ میں اس چیز کا بھی اہتمام ہو کہ قرآن کریم کی تفسیر بیان کی جائے، کوئی ایک عالم ایسا رکھا جائے جو قرآن کریم کو پڑھے، ایک رکوع یا چند آیات پڑھ کر سنائے، اس کا ترجمہ کرے، تفسیر کرے اور سمجھائے کہ اللہ تعالی نے کیا پیغام دیا ہے، اس کی تفسیر میں ہمارے مفسرین نے، علمائے کرام نے کیا کیا کہا ہے، اس کو سنیں، اگر روزانہ نہ سہی تو ہفتہ میں دو مرتبہ یا ہفتہ میں ایک مرتبہ تو ضرور ہو اور سب لوگ اہتمام سے اس میں شریک ہوں، پھر ہمارا واسطہ قرآن کریم سے ہو جائے گا، قرآن کریم کو پڑھنا، اس کی تلاوت کرنا، یہ مستقل ایک الگ عبادت ہے، اس کا مستقل ثواب ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''الٓمٓ'' یہ تین حروف ہیں، ہر حرف پر دس نیکیاں ملیں گی، الف پر دس، لام پر دس اور میم پر دس، تو ہر ہر حرف پر دس نیکیاں ملیں گی، وہ الگ عبادت ہے، یہاں تک کہ بعثت نبویؐ کے جو مقاصد ہیں ان کے اندر ایک مقصد تلاوت کتاب ہے، جیسا کہ قرآن میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے:"هو الذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة" نبوت کے اور بعثت کے مقاصد میں سب سے پہلا مقصد جو ہے وہ تلاوت کتاب ہے، کتاب کی تلاوت کرنا ہے، یہ مستقل ایک الگ عبادت ہے، اس میں ہم لوگ روپیہ میں پچیس پیسے تلاوت کرتے ہیں یعنی پچیس پرسینٹ سمجھئے، احتیاط کے ساتھ، حالانکہ اتنا بھی نہیں کرتے، مساجد کے اندر قرآن کریم رکھے ہوئے ہیں، گھروں کے اندر قرآن کریم رکھے ہوئے ہیں؛ لیکن پانچ منٹ، دس منٹ، آدھا پارہ، پاؤ پارہ پڑھنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہے، بس جن کو اللہ تعالی نے توفیق دی وہی پڑھتے ہیں، ایسے بھی ہیں جو روزانہ پورا پورا قرآن پڑھتے ہیں، تین تین پارے پڑھتے ہیں، چار چار پارے پڑھتے ہیں، ہمارے لڑکیوں کے مدرسہ میں ایک چوکیدار ہے، وہ روزانہ ایک قرآن پڑھتا ہے، یہ ابھی کی بات ہے؛ لیکن وہ لوگ چند ہیں، اگر ایسے لوگ بھی نہ رہیں تو پھر معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا، ایسے لوگ تو ہمیشہ رہے ہیں؛ لیکن عام مسلمانوں کا جائزہ لیا جائے، یہاں تک کہ ہمارے طبقہ علماء کے لوگ بھی قرآن کریم کو روزانہ نہیں پڑھتے، بس وہ رکھا ہوا ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہئے کہ روزانہ تلاوت کی جائے، وہ الگ مقصد ہے، مگر عام لوگوں کو یہاں تک کہ علماء کو بھی روزانہ تھوڑا تھوڑا ترجمہ، تھوڑی تھوڑی تفسیر پڑھنی چاہئے اور مسجد کے اندر لوگوں کے

سامنے بیان کرنی چاہئے، ورنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ تمہارے درمیان کتاب اور سنت چھوڑ کر جارہا ہوں، اس کو تھامے رکھنا، اس کو مضبوطی سے پکڑے رہنا، جب ہم کو پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا ہے، تو کیسے اس کو تھامے رکھیں گے، کیسے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں گے، اس کی کوشش بھی نہیں کرتے، کون کوشش کرتا ہے کہ ہمارے محلّہ کے اندر، ہماری مسجد کے اندر روزانہ یا ہفتہ میں ایک مرتبہ قرآن کی تفسیر ہو، قرآن کا ترجمہ ہو، سب لوگ غافل ہیں، اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں، کوشش کرنی چاہئے کہ یہ جذبہ پیدا ہو اپنے اندر اور اس کی طرف دھیان دیا جائے، ہر گاؤں میں، ہر قصبہ میں، ہر محلّہ میں اس کا مزاج بنایا جائے، قرآن سے براہ راست تعلق جوڑا جائے، جب براہ راست قرآن سے تعلق ہو جائے گا تو پھر انشاء اللہ سارے مسائل کا حل ہو جائیگا، قرآن پورا دستور ہے، پورا نظام زندگی ہے، اگر اس کو پکڑا جائے گا، اس پر عمل کیا جائے گا تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی، ایسے ہی حدیث پاک، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث روزانہ پانچوں نمازوں میں نہ سہی ایک نماز میں امام صاحب، حافظ صاحب، قاری صاحب، مولانا صاحب، ایک حدیث پڑھ دیں چھوٹی سی اور اس کا ترجمہ کر دیں تو براہ راست حدیث سے بھی رابطہ رہے گا، نبی پاک کی زندگی کی ایک ایک سنت روزانہ بتلائی جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی ایک ایک بات روزانہ بتلائی جائے تو دیکھئے زندگی میں کیسے نکھار آئے گا، کیسے مشکلیں آسان ہوں گی اور کیسے زندگی میں ترقی ہوگی اور کیسے اپنے نبی کا طریقہ معلوم ہوگا، اب ہم مسلمان ہیں، ہم باتیں تو کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی بات مانو بھائی اور پتہ کچھ نہیں کہ اللہ اور رسول کی باتیں کہاں ہیں، کیسی ہیں؟ کون سی ہیں؟ کس کو پتہ ہے؟ اور کہا سے پتہ چلے گا، کس طرح پتہ چلے گا، حدیث سے پتہ چلے گا، ہم لوگ سب دعوت دیتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی بات مانو بھائی، قرآن وحدیث کی بات مانو، ارے اللہ کے بندو، پتہ بھی ہے کہ کیا ہے قرآن وحدیث میں؟ اس کو پڑھیں گے، غور کریں گے، تب ہی تو پتہ چلے گا، قرآن کی تفسیر سنیں گے، قرآن کا ترجمہ سنیں گے تب ہی تو پتہ چلے گا کہ قرآن میں کیا ہے؟ ایک ایک حدیث روزانہ پڑھیں گے اور روزانہ سنیں گے تب ہی تو پتہ چلے گا کہ کیا ہے حدیث میں، بس ایک لفظ ہے کہ اللہ اور رسول کی بات مانو، قرآن وحدیث کی بات مانو، کہاں ہے وہ، بتلاؤ تو کیا ہے وہ قرآن کی بات؟ کیا ہے اللہ کے رسول کی بات؟ اس پر عمل نہیں ہے۔

اس لئے میرے دوستو! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ماتمسکتم بهما کتاب اللّٰه و سنتي" میں تمہارے درمیان میں دو چیزیں ایسی چھوڑ کر جارہا ہوں، اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا، اپنی زندگی کے اندر ان کو نافذ کر کے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہوں گے، کبھی زندگی کے اندر مسائل اور مشکلات نہیں آئیں گی اور وہ اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے اور میری سنت ہے، تو اس کی طرف دھیان دینا ہے اور فکر کرنی ہے، قرآن سے، حدیث سے براہ راست رابطہ رکھنا ہے، تب مسائل حل ہوں گے، صرف کہنے سے کہ قرآن کی بات مانو، حدیث کی بات مانو، ایسے نہیں کام چلے گا، عملاً پکڑنا ہے، قرآن کی عملاً روزانہ تلاوت کرنی ہے، عملاً روزانہ تھوڑا تھوڑا ترجمہ سننا ہے، عملاً تھوڑی تھوڑی تفسیر سننی ہے، ایک ایک حدیث سننی ہے، روزانہ نہ سہی ہفتہ میں دو مرتبہ، ہفتہ میں دو مرتبہ نہ سہی ہفتہ میں ایک مرتبہ تو ضرور ہونی چاہئے، اس کا مزاج بنائیں، اس کی فکر پیدا کریں تو انشاء اللہ اس فکر کا نتیجہ نکلے گا، اور ہر جگہ پھر اس کا چرچہ ہوگا اور اس پر عمل ہوگا، ورنہ تو آج کل عوام کا حال ایسا ہے

کہ ضروری مسائل سے بھی واقفیت نہیں، نماز کے مسائل، وضو کے مسائل، روزے کے مسائل، زکوۃ وغیرہ کے مسائل سے کوئی دلچسپی ہی نہیں، بوڑھے ہوگئے، نماز یاد نہیں، نماز پڑھتے ہیں، مسجد میں آتے ہیں، نہ پوچھتے ہیں، نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، لڑنے جھگڑنے، امام پر کیچڑ اچھالنے، دینی کاموں میں روڑا بننے میں بڑا مزہ آتا ہے؛ لیکن دینی معلومات حاصل کرنے میں دینی مسائل پوچھنے میں کوئی دلچسپی نہیں، طہارت کے مسائل کا پتہ نہیں، وضو اور نماز کے فرائض کا علم نہیں، دیکھ کر بڑی تشویش اور تکلیف ہوتی ہے، اگر کوئی عالم بتلائے یا سکھانے کی بات کرے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کا مذاق بناتے ہیں، اللہ ہی امت کی حفاظت فرمائے، یہ امت جو سیکھنے سکھانے والی تھی، بالکل تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، بے دینی عام ہے، جہالت عام ہے، پھر کیوں مشکلات و مسائل نہیں ہوں گے، نہ دعائیں قبول ہوتی ہیں، نہ امت کا کوئی وزن ہے، ایک بھیڑ ہے جو جھاگ کے مانند ہے، دنیا میں جس طرح جانور زندگی گزار رہے ہیں، اسی طرح ہماری بھی صبح وشام ہو رہی ہے، زندگی کا مقصد، اللہ تعالی کے ہمارے بھیجنے کا مقصد، ہمارے ذہنوں سے بالکل اوجھل ہے بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہماری زندگی گزر رہی ہے، جانور بھی اپنے مالک سے وفا کا معاملہ کرتا ہے، ہم تو اپنے مالک وخالق کو بالکل بھولے ہوئے ہیں، اس کی طاقت وقدرت کبریائی اور پکڑ کا بالکل اندازہ نہیں، اگر اس کی طاقت وکبریائی اور بڑائی کا استحضار ہو جائے تو ہماری زندگی انسانوں والی زندگی ہو جائے اور ہم اپنے پروردگار کے حقیقی بندے بن جائیں، اللہ تعالی ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے اور ہمیں قرآن کو اور حدیث کو مضبوطی سے عملاً پکڑے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی

اہم تصانیف

۱- مختصر تجوید القرآن (بروایت حفص اردو)
۲- بچوں کی تمرین التجوید (تجوید کے قواعد، مشق اور طریقہ تدریس اردو)
۳- جیب کی تجوید (تجوید کے ضروری قواعد کا پاکٹ سائز مجموعہ)
۴- ریاض البیان فی تجوید القرآن (بروایت حفص عربی)
۵- رہنمائے سلوک وطریقت ۶- مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا
۷- الامامۃ فی الصلاۃ ومسائلہا واحکامہا ۸- التدخین بین الشرع والطب
۹- حیات عبدالرشید ۲۰۰ روپئے ۱۰- سیرت مولانا محمد یحیٰ کاندھلویؒ
۱۱- تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ ۱۲- تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ
۱۳- تذکرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۴- تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۵- چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید
۱۶- مقالات ومشاہدات ۱۷- مکتوبات اکابر
۱۸- چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول
۱۹- افکار دل (۳۰ تقریروں کا مجموعہ) ۲۰- مدارس کا نظام تحلیل وتجزیہ
۲۱- تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ
۲۲- سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۲۳- لڑکیوں کی اصلاح وتربیت
۲۴- ملفوظات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ
۲۵- میری والدہ مرحومہ (نقوش وتأثرات)
۲۶- قادیانیت نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت ۲۷- اللہ ورسول کی محبت
۲۸- تذکرہ حضرت حافظ عبدالرشید رائے پوری ۲۹- بزرگان رائے پور
۳۰- نقوش حیات حضرت مولانا عبدالرحیم متالا ۳۱- تصوف اور اکابر دیوبند
۳۲- امامت کے احکام ومسائل ۳۳- حیات شیخ الحدیث
۳۴- فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات ۳۵- عقائد اور ارکان اسلام
۳۶- ماں باپ اور اولاد کے حقوق ۳۷- میرے شیخ ومرشد مفکر اسلام
۳۸- القاديانية ثورة على النبوة المحمدية ۳۹- سيرة النبى الأكرم
۴۰- درد دل ۴۱- ساز دل ۴۲- گذرگاہیں (۱۴ سفرنامے)
۴۳- تذکرہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب رائپوری
۴۴- Rules of Raising Funds ۴۵- Beliefs and Pillars of Islam
۴۵- The Laws Pertaining to Imamat
۴۶- The Rights of Perents and children
۴۷- Guidelines for Sulook and Tareeqat
۴۸- Tasawwuf and tha Elders of Deoband
۴۹- Life Sketch of Hadhrat Thanwi
۵۰- A Biogrophy of the Noblest Nabi
۵۱- My Sheikh and Spiritual Guide
۵۲- Importance of Hijab in Islam

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

Mob: 09719831058 - 09719639955

رہنمائے طلبہ

طلبہ تحریک کی تاریخ

انجینئر مصطفی محمد طحان .... ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی بھٹکل، کرناٹک

معاشرے کی تعمیر میں طلبہ تحریک کا رول:

طلبہ تحریک کو معاشرے کا اہم ستون شمار کیا جاتا ہے، اس کا انطباق جس طرح مغرب پر ہوتا ہے، اسی طرح مشرق پر بھی ہوتا ہے، جس طرح مغربی دنیا پر ہوتا ہے، اسی طرح عالم اسلام پر بھی ہوتا ہے، سامراجی طاقتوں نے اس حقیقت کا ادراک کیا تو انہوں نے لشکر، دوسروں کی زمین پر قبضہ، توپ اور جہازوں پر قائم اپنی جنگی پالیسی کو بدل دیا اور انہوں نے اس کے بدلے عیسائی مشنری، کتابوں اور یونیورسٹیوں کا سہارا لیا۔

جنگی پالیسی میں اگر سامراجی طاقتوں کو مال اور جانوں کو خرچ کرنا پڑتا تھا تو دوسری پالیسی میں مکاری اور تکلّفات میں مبالغہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، چند مصنّفین سامراج کے مقاصد اور افکار کو بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں اور تعلیم وتربیت کے ذریعہ طلبہ اور طالبات کی پختہ اسلامی عقل کی ازسرنو تشکیل اور اس میں تبدیلی لانے کے لئے دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں۔

اسی طریقے سے انہوں نے ہمارے ملکوں میں پوری ایک نسل تیار کی ہے، جن کو ''بیداری کی نسل'' سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کو لیبل تو ہماری تہذیب کا ہے، زبان اسلام اور عربوں کی ہے لیکن فکر، مقاصد اور طریقہ کار فرنگیوں کا ہے، یوروپی ملکوں نے مسلمانوں کے اکثر ملکوں میں اپنی یونیورسٹیاں اور اسکول کھولے، اب تک یہ اسکول اور یونیورسٹیاں مغربی پالیسیوں کو تیار کرنے کے کارخانے ہیں، استنبول کی ''روبرٹ امریکی کالج'' یونیورسٹی ہی میں عثمانی حکومت کے خلاف سازش تیار کی گئی، بیروت، قاہرہ اور انقرہ میں امریکی یونیورسٹیوں ہی نے ان علاقوں میں امریکی سیاست ماضی میں چلائی ہے اور اب تک چلاتی آرہی ہے۔

اکثر اسلامی علاقوں میں ملکی یونیورسٹیاں بھی مغربی اساتذہ کے ہاتھوں ہی قائم ہوئی ہے، ان میں ہر چیز کا منصوبہ انہوں نے بنایا ہے، پڑھائی جانے والی کتابیں، نصاب تعلیم، افکار، زندگی سے لاتعلق مذہب اور اسلام کی تعلیمات سے دور رکھنے والے اخلاق، یہ تمام چیزیں ان ہی کی تیار کردہ ہیں، قوم کی محنت اور ذرائع ووسائل سے تیار کردہ یہ یونیورسٹیاں دراصل عقائد واخلاق اور امت کی قدروں کی مخالفت کرنے والے اور مغربی فکر پھیلانے والے افراد کی تربیت گاہیں ہیں، طلبہ کی تحریک نے اس خطرناک فکری رجحان اور امت اور اس کی نسلوں اور اس کے مستقبل کو نشانہ نہ بنانے والے اس خطرناک منصوبے کو ناکام بنانے کی کوشش شروع کردی ہے، مخلص قومی تحریکات نے اس خامی کو محسوس کیا اور اسی وقت سے اپنی طاقت بھر، کم اور بے حیثیت وسائل کے ذریعہ اس سیلاب کا مقابلہ کرنا شروع کردیا ہے۔

یہیں سے عالم اسلام میں طلبہ تحریک کی نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، اس عظیم علاقے کے گوشے گوشے کی یہ روشن تاریخ ہے، اس میں طلبہ تحریک نے اپنی امت کے پرچم کو ماضی کی مدافعت، حال کی تعمیر اور مستقبل کے لیے منصوبہ تیار کرتے ہوئے بلند کیا

ہے، طلبہ تحریک پوری بیسوی صدی سامراجیت کے خلاف انقلاب برپا کرنے میں ہرقوم کی سرخیل رہی ہے اور امت اور اس کے دشمنوں کے درمیان ہر جنگ کا سامان بنی رہی ہے، اگر آج یہ تحریک ترقی اور روشنی کی قندیلیں بلند کئے ہوئے ہیں تو یہ صرف امت کی قیادت میں اس کی طویل پختہ تاریخ کا طبعی اور فطری امتداد ہے، اسی وجہ سے آنے والی نسلوں کے لئے اپنے اسلاف کی تاریخ جاننا ضروری ہے تاکہ اس پر فخر کریں اور اس سے انتساب میں عزت محسوس کریں، حال کو روشن کرنے اور بہترین مستقبل کا منصوبہ بنانے کیلئے اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں، اسی وجہ سے ہمارا ارادہ ہے کہ اس ''رہنما کتاب'' کا اختتام دنیا میں پائی جانے والی طلبہ تحریکات کی تاریخ پر ہو، اگر اس کی تفصیلات میں جائیں تو یہ رہنما کتاب سینکڑوں نہیں، ہزاروں صفحات کو سیاہ کردے گا، اسی وجہ سے ہم نے دنیا کے ہر علاقے کے ایک ملک کی تاریخ کو نمونے کے طور پر پیش کیا ہے، پھر ہم نے عالمی طلبہ تحریک کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا ہے، جلد ہی امید ہے کہ دنیا کے طلبہ کی تمام طلبہ تحریکات پر ایک کتاب ترتیب دیکر شائع کی جائے گی۔

عالم اسلام چودہ صدیوں سے شریعت اسلامی کی طرف سے تمام انسانوں کو عطا کردہ ان ہی حقوق سے مستفید ہو رہا ہے، جب کہ اس وقت یورپ غلامی اور ظلم وزیادتی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا اور وہاں جنگل راج تھا۔

بیسوی صدی عیسوی کے درمیانی سالوں ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ جاری کیا، اس اعلامیہ کی پوری دنیا میں تائید کی گئی اور اس پر دستخط کئے گئے اور اس کی نگرانی کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے، اسی دن کو ''حقوق انسانی کا عالمی دن'' قرار دیا گیا، اقوام متحدہ اس کو ہر سال مناتی ہے، حقوق انسانی کی یاد دلانے اور ان حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کو رسوا کرنے کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کے تمام ممبر ملکوں کی طرف سے اس اعلامیہ پر دستخط کرنے اور اس اعلامیہ کی پابندی کے وعدے کے باوجود بہت سے ملکوں میں ان حقوق کو پامال کیا جاتا ہے اس کی لاتعداد مثالیں، لیکن ان پامالیوں کو روکنے یا ان مرتکبین پر مقدمہ چلانے کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کا کردار خاموش تماشائی کا ہے۔

اس وقت پوری دنیا کو اسلام کی طرف سے اپنی عظیم تہذیبی ترقی کے دور میں دنیا کے گوشے گوشے میں عام کردہ عدل وانصاف، امن وامان اور حقوق کی ضرورت ہے۔

حقوق انسانی کا عالمی نقشہ:

(۱) تمام لوگ آزاد پیدا ہوئے ہیں، شرافت وعزت اور حقوق میں سب یکساں ہیں۔

(۲) کسی امتیاز کے بغیر اس اعلامیہ میں مذکور تمام حقوق اور آزادیوں سے مستفید ہونے کا ہر ایک انسان کا حق حاصل ہے۔

(۳) ہر شخص کو آزادی اور سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ہے۔

(۴) کسی شخص کو غلام بنانا درست نہیں ہے۔

(۵) کسی بھی انسان کو سخت سزائیں دینا درست نہیں ہے۔

(۶) ہر شخص کو چاہئے وہ کہیں کا ہو اپنی قانونی شخصیت کو ثابت کرانے کا حق حاصل ہے۔

(۷) قانون کے نزدیک سب انسان یکساں ہیں۔

(۸) ہر شخص کو ظلم کی صورت میں مقدمہ دائر کرنے کے لئے ملکی عدالتوں کا رخ کرنے کا حق ہے۔

(۹) ناحق کسی انسان کو گرفتار کرنا یا اس پر پابندی عائد کرنا یا جلاوطن کرنا درست نہیں ہے۔

(۱۰) ہرانسان کواپنے مسئلے کی کسی بھی غیر سرکاری عدالت کے سامنے اعلانیہ اور عادلانہ طور پر کارروائی کرانے کا حق ہے۔

(۱۱) ہر متہم شخص جرم ثابت ہونے سے پہلے بری تصور کیا جائے گا، کسی بھی شخص کو اسی وقت مجرم قرار دیا جائے گا جب وہ عمل ارتکاب کے وقت ملکی یا بین الاقوامی قانون کے مطابق جرم شمار کیا جا تا ہو۔

(۱۲) کسی ذاتی زندگی میں بیجا مداخلت کرنے کی اجازت نہیں۔

(۱۳) ہر فرد کو کسی بھی حکومت کے حدود میں جانے کی آزادی ہوگی، جب چاہے اس کو چھوڑنے اور اپنے ملک دوبارہ واپس آنے کا بھی حق ہوگا۔

(۱۴) ہر شخص کو ظلم سے بچنے کے لئے کسی دوسرے ملک میں پناہ لینے کا حق ہوگا۔

(۱۵) ہر شخص کو کسی بھی جنسیت کو اختیار کرنے کا حق ہے، اس کو ناحق اس سے محروم کرنا جائز نہیں۔

(۱۶) خاندان معاشرے کا فطری گروہ ہوتا ہے، مرد اور عورت کو بلوغت کے بعد شادی کا حق حاصل ہے، شادی دونوں کی رضامندی سے کی جائے گی۔

(۱۷) ہر شخص کو تنہا یا دوسرے کے اشتراک سے ملکیت کا حق حاصل ہے، کسی کو اس کی ملکیت سے ناحق محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

(۱۸) افکار وخیالات اور دین کی آزادی کا ہر شخص کو حق ہے۔

(۱۹) ہر شخص کو تنظیموں اور جماعتوں میں شریک ہونے کی آزادی ہے، کسی کو کسی بھی ادارے سے منسلک ہونے کیلئے مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

(۲۰) ہر ایک کو آزادی رائے کا حق ہے۔

(۲۱) قوم کی خواہش کے مطابق ہی حکومت قائم کی جائیگی، ہر ایک کو اپنے ملک کے تمام کاموں کے انتظام کا مباشرتاً اپنے نمائندوں کے انتخاب کے ذریعے جائزہ لینے کا حق حاصل ہے۔

(۲۲) معاشرتی تحفظ کا ہر ایک کو حق ہے۔

(۲۳) ہر شخص کو کام کرنے اور بے کاری سے بچنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح اپنی شریفانہ زندگی کے لئے کافی ہونے والی اجرت لینے کا حق حاصل ہے۔

(۲۴) ہر ایک کو آرام کرنے، کام کے اوقات کی مناسب تعیین اور میعادی چھٹیوں کا حق ہے۔

(۲۵) ہر شخص کو اپنی صحت کی حفاظت اور اپنی اور اپنے خاندان کی خوشحالی کے لئے معیشت کا بلند معیار بنانے کا حق ہے، خصوصاً ماں اور بچے کی پرورش پر خصوصی توجہ دی جائے۔

(۲۶) ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔

(۲۷) ہر شخص کو معاشرے کی ثقافتی زندگی میں شریک ہونے کا حق ہے، اسی طرح اس کو اپنی علمی، ادبی یا فنی کاوشوں پر مرتب ہونے والے ادبی اور مادی مفادات کے تحفظ کا حق ہے۔

(۲۸) ہر شخص کو اس بین الاقوامی معاشرتی نظام سے مستفید ہونیکا حق ہے، جس سے اس اعلامیہ میں مذکور حقوق اور آزادیوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

(۲۹) ہر شخص پر معاشرے کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، وہ اپنے حقوق اور آزادیوں کو حاصل کرنے میں صرف قانون کی طرف سے عائد کردہ پابندی کا تابع ہوگا۔

(۳۰) اس اعلامیہ کے کسی نص کی تاویل اس بنیاد پر جائز نہیں ہوگی کہ یہ نص اس اعلامیہ میں مذکورہ حقوق اور آزادیوں کو پامال کرنے والی کسی سرگرمی میں رکاوٹ بن رہا ہے۔

طلبہ تحریک اورحقوق انسانی:

طلبہ تحریک حقوق انسانی پر خصوصی توجہ دیتی ہے، طلبہ تحریک ہی حقوق کا سب سے پہلے دفاع کرنیوالی اور اس کے مفادات کی

پہلی محافظ ہے، وہی اپنے قومی معرکوں کی سرخیل ہے اور اس پر کسی بھی ظلم کے بارے میں سوچنے والے کے خلاف سب سے پہلے اٹھ کھڑی ہونے والی ہے۔

اس کے لئے ہر جگہ طلبہ تحریک نے بڑی قربانیاں دی ہیں، پابندیوں، جیل خانوں آزادی کو سلب کرنے اور حقوق کی پامالی جیسے مظالم کو برداشت کیا ہے، اور ان کو سہا ہے اور یہ سلسلے اب بھی جاری ہیں، ان تمام مشکلات کو عجیب وغریب صبر اور پختہ ایمان کے ساتھ برداشت کیا ہے، اسی وجہ سے طلبہ تحریک کو حقوق کا پہلا مدافع اور آزادیوں کا پہلا محافظ ہونے کا حق حاصل ہے۔

متعدد وسائل کے ذریعے طلبہ تحریک ''حقوق انسانی کے عالمی دن'' کی یادوں کو تازہ کرسکتی ہے، ان میں اہم مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حقوق انسانی کا تعارف کرنے اور ان کو پامال کرنے کی کوشش کو رسوا کرنے کیلئے علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سیمیناروں کا انعقاد۔

(۲) مسئلے کے تعارف کے لئے کتابچوں اور معیاری اشاعتوں کا اجراء۔

(۳) حقوق انسانی کو پامال کرنے کی کوششوں کے خلاف مظاہروں کا انتظام۔

(۴) حقوق انسانی کی مدافعت کرنیوالی علاقائی اور بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ تعاون اور مشترک سرگرمیوں کا اہتمام۔

(۵) حقوق انسانی کی یادوں کو تازہ کرنے کیلئے نمائشوں اور تقریری پروگراموں کا انعقاد۔

(۶) اس مسئلے کی مدافعت میں فنی کاوشوں کو پیش کرنا اور ڈراموں کے ذریعے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا۔

(۷) حکومت کی قانون ساز کمیٹیوں سے رابطہ اور ان کے ساتھ تعاون یا ان کے بعض شریف لوگوں کے ساتھ رابطہ۔

(۸) حقوق انسانی کی کسی بھی پامالی کے مقابلے کے لئے حکومت کے ساتھ دائمی رابطہ رکھنے والی کمیٹیوں کی تشکیل۔

عالمی یوم طالب علم:

☆ آزادی کی قدروں کا احیاء اور ظلم و ناجائز قبضے کا انکار۔

☆ طلبہ کی تحریک کے قومی رول کو اجاگر کرنا۔

☆ طلبہ تحریک کی آفاقیت کی تکمیل۔

☆ امت کے مسائل کا احیاء اور اس میں طلبہ کا کردار۔

عالمی یوم بیت المقدس:

☆ فلسطین اور بیت المقدس کی اہمیت میں اضافہ کرنا۔

☆ مسئلہ فلسطین کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ۔

☆ امت کے خلاف سازش کرنیوالے مغرب اور صہیونیت کی کوششوں کو ناکام بنانا۔

☆ برسرپیکار فلسطینی قوم کا مادی ومعنوی تعاون۔

☆ مسلمانوں کے اتحاد واتفاق میں اضافہ کرنا۔

☆ طلبہ تحریک کی آفاقیت کی تکمیل۔

☆ ہر جگہ کے مسلمانوں کا تعاون کرنے میں طلبہ تحریک کا قائدانہ رول کو یقینی بنانا۔

حقوق انسانی کا عالمی دن:

☆ اسلام مغربی تہذیب سے پہلے آیا اور اس نے انسان کے تمام حقوق کی کفالت کی۔

☆ طلبہ تحریک حقوق انسانی کی پہلی مدافع اور اس کی کسی بھی پامالی کے خلاف ہے۔

☆ حقوق کی حفاظت اور انصاف کی تکمیل کے مناسب موقع کے طور پر حقوق انسانی کے عالمی دن کو یاد تازہ کرنے کی طلبہ تحریک کوشش کرتی ہے۔

غور وفکر

مسلمانوں کی زبونحالی کا ذمہ دار کون؟

مولانا برہان الدین قاسمی ڈائیریکٹر مرکز المعارف، ممبئی

عموماً ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ تمام تر مذہبی، تعلیمی اور سماجی خدمات علماء کرام کے ذریعہ ہی انجام پائیں، جبکہ دوسری طرف ان کو نااہل سمجھنا، ان کی حمایت اور تائید کرنے کے بجائے انہیں تنقید کا نشانہ بنانا بھی ہمارا شیوہ بن چکا ہے، کیا یہ اپنے آپ میں متضاد فکر نہیں ہے؟ کیا اس طرح کی تضاد بیانی اور منفی سوچ ہمارے اندر نہیں پائی جاتی ہے؟ ذیل کی سطروں میں موجودہ چیلنجز اور اپنی کارکردگی پر غور فرمائیں:

(۱) ۲۹ر جولائی ۲۰۱۹ء کو ہندو سینا کے ایک شخص نے وزیر داخلہ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس نے ہندوستان کے تحفظ کو لاحق خطرہ کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کریم پر پوری طرح سے پابندی لگانے کا مطالبہ کیا، سوال یہ ہے کہ علماء کو معتوب قرار دینے والے لوگوں نے اس کے جواب میں کیا کیا؟

(۲) اعظم خان کی متنازع شخصیت ایک طرف، ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں اس کی حمایت کریں یا نہ کریں؛ لیکن ایسے وقت میں جبکہ جوہر یونیورسٹی کے وجود پر سوالیہ نشان لگ رہا ہے جو کہ ایک تعلیمی ادارہ اور ہندوستان کا قیمتی اثاثہ ہے، تو کیا اس کے لئے جدید تعلیم یافتہ حضرات کو کھڑا نہیں ہونا چاہئے؟

(۳) آسام میں این آرسی، طلاق بل، آرٹی آئی بل، یو اے ترمیم بل، شہریت ترمیم بل، ہندوستان کی جدید تعلیمی حکمت عملی اور اس جیسے دسیوں سنگین مسائل درپیش ہیں، ان مسائل کے حل کیلئے علماء کو لعن طعن کرنیوالے افراد نے کیا اقدامات کئے ہیں؟

افسوس صد افسوس ''ایک ہاتھ میں سائنس اور دوسرے ہاتھ میں قرآن'' اور اس جیسے دیگر عظیم مقاصد اور جذبے کے تحت مسلمانوں کی قائم کردہ یونیورسٹیوں کے فضلاء ایسے نازک حالات میں بھی اپنی حصے داری نبھاتے نظر نہیں آتے ہیں، جب کہ قوم نے ان کو وہ سب دیا ہے جن سے وہ مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی طور پر صحیح رہنمائی کرسکتے تھے؛ لیکن ہائے افسوس!

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کے باوجود ان میں سے کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں کا یہ الزام ہے کہ کچھ مولانا ان کی راہ میں حائل ہیں اور وہ انہیں میدان عمل میں اترنے نہیں دیتے۔

حالات کی سنگینی تو یہ ہے کہ لو جہاد کے نام پر مسلم نوجوانوں کو ایذاء پہنچانا، گائے کے نام پر ماب لنچنگ اور اب جے شری رام کے نام پر ظلم وبربریت کے واقعات کی وجہ سے عام مسلمان جہاں ایک طرف حواس باختہ ہیں تو وہیں دوسری طرف نوجوان طبقہ نفسیاتی طور پر خوف وہراس اور عدم اعتماد کا شکار ہے، بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب کچھ مسلمان اپنی شناخت ہی چھپا رہے ہیں اور قسمت کا رونا رو رہے ہیں۔

کیا ایسے نازک حالات میں جدید علوم وفنون سے آراستہ حضرات کو میدان عمل میں نہیں آنا چاہئے؟ کیا ان تشویشناک حالات پر قابو پانے کی ضرورت نہیں؟ کیا انفرادی طور پر جدید تعلیم

یافتگان نے اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر قدم اٹھایا ہے؟ کیا ہی بہتر ہوتا کہ علماء کو کوسنے میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ حضرات اپنی بساط بھر کوئی کارخیر ہی انجام دے لیتے:

شکوہ ظلمت شب سے تو یہی بہتر تھا
اپنے حصہ کی کوئی شمع جلاتے جاتے

عزیزان ملت! طلاق ثلاثہ بل کے پاس ہوجانے کے بعد حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ ہندوستانی آئین کے دفعہ ۱۴/اور۱۵/ کے تحت اب جنسی انصاف ومساوات کی بنیاد پر تعداد ازدواج اور مسلم وراثت جیسے مسائل آج نہیں تو کل سپریم کورٹ میں ضرور لائے جائیں گے، کیا ان مقدمات کی پیروی کرنا صرف علماء کی ذمہ داری ہے؟ کیا علماء کرام کو ہی تن تنہا تمام مسائل سے نبردآزما ہونا چاہئے اور کیا ان میں ان تمام کاموں کی صلاحیت بھی ہے؟

اہم سوال یہ ہے کہ آخر اعلی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سے مسلم کمیونٹی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مسلم وکلاء، اسلامی تعلیمات کے ماہرین، جدید قانون کے رمزشناش نیز عالمی قوانین سے آراستہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں تیار ہوسکے؟، ابھی تک ہم نے کتنے لاء کالج قائم کئے، آخر جمعیت علماء ہند اور اس جیسی مسلم تنظیمیں ہی صرف کیوں جیل کی سلاخوں میں محصور نوجوانوں کی رہائی کی خاطر عدالت میں مقدمات لڑرہی ہیں؟ آخر مسلمان اپنے مقدمات کو صحیح طریقے سے لڑنے کے لئے غیر مسلم وکیل کو کیوں اجرت پر لینے پر مجبور ہیں؟ ایک ڈاکٹر ظفر محمود جب ہمیں ہر سال درجنوں ''یو پی ایس سی'' میں کامیاب امیدوار دے سکتے ہیں جو کہ انتہائی حوصلہ افزا بات ہے تو سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے حالات بدلنے کے لئے مزید ظفر محمود ہماری صف میں کیوں پیدا نہیں ہورہے ہیں؟

آخر ہم ابھی تک بہترین صحافیوں کی ایک جماعت کیوں پیدا نہیں کرسکے؟ آخر ہندوستانی مسلمانوں کا ابھی تک اپنا کوئی ایک بھی مین اسٹریم میڈیا یا ہاؤس کیوں قائم نہیں ہوسکا؟ ہماری نمائندگی پولیس اور افواج میں بالکل معمولی ہے، کیا ہم نے اس سلسلے میں اب تک کوئی مضبوط قدم اٹھایا ہے؟ یونیورسٹی اور اسکول میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ کرام نے کیا کبھی اپنی درسگاہوں میں مذکورہ مسائل پر لب کشائی کی ہے؟ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے کی ہوگی؛ لیکن اکثر لوگ اس سے غافل ہیں، کیا ہم نے کبھی علماء اور دینی تنظیم کے زیر نگرانی چل رہے مدارس، اسکول اور کالجز نیز علماء کرام پر الزام تراشی کرنیوالے حضرات کے تحت چل رہے اداروں کو شمار کیا یا ان کا جائزہ لیا ہے؟

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علماء کرام نے دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ملک کے ہر گوشے میں مدارس اور مکاتب کا جال بچھایا ہے تو آخر جدید تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کے لئے اسکول اور کالج اسی تعداد میں کیوں قائم نہیں کئے؟

ہند اور بیرون ہند اعلی عہدوں پر فائز بڑی بڑی تنخواہ پانے والے جدید تعلیم یافتہ حضرات مسلم برادری کے لئے سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی کیلئے کیا خدمات انجام دے رہے ہیں؟ خود اپنی ذات سے ایمانداری سے پوچھیں کیا ہم بانیان علی گڑھ اور جامعہ ملیہ وغیرہ کے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعلیم کر پائے؟ اس سے انکار نہیں کہ کچھ حضرات نے یقیناً کوشش کی ہے اور اب بھی ان کی محنت جاری ہے؛ لیکن ان کی تعداد فرض کفایہ کے درجے کو بھی نہیں پہنچتی، پھر کیسے اسی پر اکتفا کرلینا دانشمندی ہوگی؟

یقیناً یہ پرآشوب دور مسلمانوں کی آپسی چپقلش اور الزام تراشی کا نہیں بلکہ برادران وطن کیساتھ یک جٹ ہوکر ملک کو تباہی سے بچانے اور بطور مسلم اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنیکا ہے۔

حسین یادیں

شیخ الحدیث

حضرت مولانا قاری عاشق الٰہی صاحب کا وصال

محمد مسعود عزیزی ندوی

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب کا نام بچپن سے ہی سننے کو ملا، اس لئے کہ وہ ریڑھی تاجپورہ کے زمانہ طالب علمی میں والد ماجد حضرت حافظ عبدالستار صاحب عزیزی کے شاگرد خاص اور خادم خاص تھے، والد صاحب کیلئے چائے بنانا، کھانا کھلانا، کپڑے دھلنا، کمرے کی صفائی اور دیگر ضروری خدمت وہی انجام دیتے تھے، اس لئے والد صاحب ان کا بڑا تذکرہ کرتے رہتے تھے اور وہ بھی اس تعلق کو نبھاتے تھے، اخیر تک انہوں نے اس رشتے کا لحاظ کیا، وہ جب بھی علاقے میں آتے، تو والد صاحب صاحب کو ضرور ملنے کے لئے آتے اور ہمیشہ والد صاحب کو ہدیہ دیتے تھے، والد صاحب بھی اپنے اس ہونہار اور لائق وفائق شاگرد پر بہت فخر کرتے تھے، ہمارا بھی کبھی جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ جانا ہوا، تو وہ بہت اکرام کرتے تھے، اپنا استاذ زادہ سمجھ کر کافی اہمیت دیتے تھے، وہ فراغت کے بعد مدرسہ فیض ہدایت رحیمی رائے پور میں مدرس ہو گئے تھے، پھر اس کے بعد مستقل جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ آ گئے تھے، اور وہاں مختلف کتابوں کو پڑھاتے ہوئے ترقی کرتے گئے، اور نائب مہتمم بنائے گے، اس کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا اصغر علی صاحب کے انتقال کے بعد شیخ الحدیث بنادئے گئے، کسی بھی دینی ادارے میں شیخ الحدیث کا منصب بہت جلیل اور عظیم ہوتا ہے، اور ترقی کی آخری منزل سمجھا جاتا ہے، اس عہدہ جلیلہ پر وہ کئی سال تک فائز رہے، اور بالآخر وہ ہمارے حساب سے اچانک اور فیصلہ خداوندی کے مطابق اپنے وقت پر اپنے رب کے پاس چلے گئے، اللہ تعالی مولانا موصوف کی مغفرت فرما کر درجات بلند فرمائے اور اعلی علیین میں مقام رفیع نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حضرت مولانا عاشق صاحب کو والد محترم خطوط بھی لکھتے تھے، ایک خط مولانا نے دیا، جس میں والد صاحب نے ان کی لیاقت کا اعتراف بھی کیا اور ان کو دعائیں بھی دیں، وہ خط مولانا کے پاس محفوظ تھا، ایک ملاقات پر امانت کے طور پر مجھ کو دیا، وہ مندرجہ ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مهربان محبت نشان زادت محبته

میں آپ کی عنایت کا بدل شکرگزار و سچی وفاداری کا قائل ہوں، میں نے آپ کو ایک خاص امر کے لئے تکلیف دی، آپ نے اس کو قبول فرمایا، بشرطیکہ خاطر عالی کو گراں بار نہ ہوا ہو، اگرچہ آپ کو ہمت بندھانے وجرأت دلانے کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ آپ محتاج نصیحت کے نہیں، خود پختہ مزاج ہو، آپ نے بدیں وجاہت ولیاقت وامارت وجلالت مجھ جیسے ناچیز سے مشفقانہ تعلق، سلسلہ محبت وارتباط دلی کو قائم رکھا، خدا آپ کو سلامت رکھے اور اس سے اعلی رتبہ پر پہنچا دے، باقی اس ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھتے رہئے، جواب کا منتظر رہوں گا، حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے۔

۴/نومبر ۱۹۹۵ء عبدالستار عزیزی

۲۰/فروری ۲۰۱۲ء میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا، ان کے جنازے میں بھی شرکت کے لئے مولانا تشریف لائے تھے، اور مندرجہ ذیل تحریر بھی پیش کی، جو والدہ مرحومہ نامی کتاب میں شائع شدہ ہے:

مخدوم ومربی جناب الحاج حافظ ماسٹر عبدالستار صاحب
عزیزی عمت فیوضکم
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بعد تحیہ وآداب! یہ جان کر کہ جناب مفتی محمد مسعود عزیزی صاحب سلمہ کی والدہ محترمہ بلکہ ہم سب فیضیافتگان (تلامذہ) کی روحانی ماں یعنی آنجناب کی رفیقہ حیات بتاریخ ۲۷/ربیع الاول ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰/فروری ۲۰۱۲ء رحلت فرماگئیں، جس سے انتہائی صدمہ ہوا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فدوی نے دوران تعلیم وتربیت آپ کی زبانی بارہا مرحومہ کی بہت خوبیاں وخصائل حمیدہ سن رکھیں ہیں، جو آج اچانک ذہن میں ایسی تازہ ہوگئیں ہیں کہ گویا انہیں فدوی ابھی سن رہا ہے، امی مرحومہ پابند صوم وصلاۃ بااخلاق اور انتہائی ملنسار، ہمدرد وغم گسار تھیں، غرباء پروری تو گویا گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، آپ پر گزرنے والے وقت کے نشیب وفراز میں صبر وسکون کے ساتھ نہ صرف ساتھ دیتی تھیں، بلکہ بسااوقات آپ کو اور پورے گھر والوں کو ترغیب دے کر حالات کا مقابلہ صبر واستقامت کے ساتھ کرنے کا درس دیتی تھیں، ایسی عالی صفات عورتیں کم پیدا ہوتی ہیں، جو قائدانہ خدمات انجام دیتی ہیں؛ لیکن استاذ محترم دنیا میں ہر آنے والا جانے کے لیے آیا ہے، موت سے رستگاری ناممکن ہے، اس لیے صبر میں نعم البدل کا وعدہ ہے، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ آپ کے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے، اور سبھی صاحبزادگان پر بھی،

میں بھی غم میں برابر کا شریک ہوں، اور بصمیم قلب دعا گوں ہوں کہ اللہ تعالی مرحومہ کو اگلے عالم میں سکون نصیب فرمائے۔

آپ کا خادم
محمد عاشق الہی ۲۰۱۲/۲/۲۱ء
خادم المدرسین جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ

پھر ۱۷/جولائی ۲۰۱۶ء کو والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اس موقع پر بھی تشریف لائے اور جب والد صاحب کے حالات پر ''نقوش اسلام'' کا خصوصی نمبر نکالا گیا، اس میں والد صاحب کے حالات پر مندرجہ ذیل مضمون تحریر کیا:

''میرے مربی، میرے مشفق، میرے ہمدرد، میرے محترم استاذ یعنی حضرت الحاج الحافظ منشی عبدالستار صاحبؒ جن کے دامن عاطفت میں رہ کر میں نے ۱۹۶۵ء میں اپنی فوقانی تعلیم کا آغاز کیا اور مسلسل دوسال تک تعلیم کے ساتھ ساتھ انکی ہر نوع کی خدمت (ناشتہ تیار کرنا، کھانا لانا، کپڑوں کی صفائی، کمرہ کی صفائی، نیز ان کی کتابوں ودیگر اشیاء کی آرائش وحفاظت) کا شرف حاصل کیا، مخدوم ومرحوم! مجھے پرخلوص انداز میں مختلف متعدد ماحول میں رہ کر زندگی گزارنے کے آداب وسلیقے بھی سکھایا کرتے تھے، اسی کا ثمرہ ہے کہ بحمد اللہ آج اہل اللہ وبزرگان دین کی روح پرور مجالس ہوں یا رؤساء وامراء کی رنگین وپررونق محفلیں جن میں نشست وبرخاست کا اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، ہر کام میں انابت ومحبوبیت حاصل ہورہی ہے، اس میں میرے دوسرے کرم فرما اساتذہ کرام کی تربیت کا بھی خاصا دخل ہے۔

استاذ مرحوم کے زندگی کے سانس کی آخری حرکت تک مجھ پر یکراں احسانات اور بے پناہ شفقتیں سایہ فگن رہیں، انہیں جب میں یاد آتا تو فوراً فون کے ذریعہ پوچھتے کہ تم نے مجھے پہچان لیا؟ میں جواباً عرض کرتا کہ اپنے عظیم محسن کو کیسے بھول سکتا ہوں، چونکہ میں ان کی آواز پہچان لیتا تھا، پھر سلسلہ گفتگو میں اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے کہ میں صدق دل سے کہتا ہوں کہ مجھے الحمدللہ اس پر ناز وفخر ہے کہ میں آپ جیسے لائق شاگرد کا استاذ ہوں، یہی نہیں بلکہ میں آپ کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں، حتی کہ میں اپنے اس تصور کا مخلصین کے مابین بھی برملا اظہار کرتا رہتا ہوں، گذشتہ رمضان المبارک سے قبل باہر سفر میں جانے کے وقت انہوں نے فون پر تقریباً نصف گھنٹہ تک تفصیلی گفتگو کی، جس میں اپنے وقتی

حالات کی نیز ضروری راز و نیاز کی باتیں کیں، انکی سب باتیں لگن ودلچسپی سے سنیں اور موقعہ بموقعہ جواباً تسلی آمیز کلمات سے انہیں محظوظ کرتا رہا، وہ بہت مسرور رہوئے۔

آخر میں فرمایا میرے عزیز! تمہیں اپنی سرگزشت سنا کر میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا، اب مجھے الحمدللہ بے حد سکون ہوگیا، پھر شکایت کرتے ہوئے فرمانے لگے میں ہی تمہیں کبھی فون کرلیتا ہوں تم کبھی فون نہیں کرتے، میں نے اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس وقت مجھے ایک نیک سفر درپیش ہے، واپسی پر عید الفطر کے بعد انشاء اللہ آپ کے پاس ضرور حاضر ہوکر ملاقات کا شرف حاصل کروں گا، لیکن افسوس کیا معلوم تھا کہ ان سے دنیاوی زندگی میں ملاقات مقدر نہ ہوگی، کہ اچانک ۱۱؍شوال المکرّم ۱۴۳۷ھ بروز اتوار بوقت شام عزیزم مفتی محمد مسعود عزیزی سلمہ خلف الرشید کے فون کی گھنٹی بجی اور یہ غمناک خبر سنی کہ آپ کے محترم ومربی استاذ اور میرے والد مکرم اس دار فانی سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اس طرح جانبین کے دلی ارمان دل میں ہی رہ گئے: ؎

آخر شب کہ ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

بصمیم قلب دعا ہے کہ اللہ تعالی مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، بعد عصر مظفرآباد پہنچ کر چہرۂ مبارک کا آخری دیدار کیا اور بعد نماز مغرب بزرگ ہستی حضرت مولانا سید مکرم حسین صاحب دامت برکاتہم نے نماز جنازہ پڑھائی، آخری رسومات شرعیہ میں شرکت کرکے قلب مغموم کے ساتھ کف افسوس ملتے ہوئے، یہ شعر پڑھا اور واپس لوٹ آیا:

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

آں مخدوم کے جملہ اعزاء وبالخصوص صاحبزادگان وبیٹیوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں، اور مکرر صبر کی تلقین کرتا ہوں‘‘۔

حضرت قاری صاحب کے مزاج میں سادگی تھی، وہ شیخ الحدیث اور نائب مہتمم جیسے عظیم عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود بہت سادہ رہتے تھے، ان کو دیکھنے سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے عظیم انسان ہیں، ان کی صلاحیت، ان کے اخلاق وکردار اور ان کی عظیم شخصیت کے سبھی معترف تھے، وہ زمانہ طالب علمی سے بڑے چاک وچوبند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بڑے نشیط تھے، اللہ تعالی نے ان کے اندر بہت سی خصوصیات رکھی تھیں، وہ اپنے چھوٹوں پر بڑے ہی شفیق تھے، ناکارہ نے ان کو زیادہ نہیں دیکھا مگر جس قدر دیکھا، اس سے ان کی عظیم شخصیت کا، ان کی علمی سادگی کا پتہ چلا، اللہ تعالی مولانا کو اپنے خاص بندوں میں شامل فرمائے۔

حضرت قاری صاحب کی پیدائش ۱۸؍اپریل ۱۹۵۲ء کو شریف احمد کے یہاں موضع دجھیڑی ضلع سہارنپور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ میں متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی، پھر مظاہرعلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۲ء میں مظاہر علوم سے فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد مدرسہ فیض ہدایت رحیمی رائے پور میں پانچ سال تک تعلیمی خدمات انجام دی، ۱۹۷۷ء میں جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ میں آپ کا تقرر ہوا، اور ۴۲؍سال تک مختلف درجات میں پڑھاتے ہوئے شیخ الحدیث بنائے گئے اور ہزاروں شاگردوں کو فیضیاب کیا، بیعت وسلوک کا تعلق حضرت مفتی مظفرحسین صاحب سابق ناظم مظاہرعلوم سہارنپور سے قائم کیا، پھر حضرت مولانا سید محمود الحسن صاحب پٹھیڑوی سے منسلک ہوئے اور انہیں سے اجازت بیعت حاصل کی، اس طرح آپ کا علمی اور روحانی فیض جاری تھا کہ اللہ تعالی نے آپ کی نیکیوں کا بدلہ دینے کیلئے اپنے پاس بلالیا، اللہ تعالی ہمیں پاک لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حقیقت یا سراب

جب میری وفات ہوئی!!!

پروفیسر اظہار الحق

''سرما'' کی ایک ٹھٹھرتی شام تھی جب میری وفات ہوئی، اس دن صبح سے بارش ہورہی تھی، میری بیوی مجھے صبح ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی، ڈاکٹر نے دوائیں تبدیل کیں، مگر خلافِ معمول خاموش رہا، مجھ سے کوئی بات کی نہ میری بیوی سے، بس خالی خالی آنکھوں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

دوپہر تک حالت اور بگڑ گئی، جو بیٹا پاکستان میں تھا وہ ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں بیرون ملک گیا تھا، چھوٹی بیٹی اور اس کا شوہر دونوں کسی فیکٹری میں سروے کے لیے کراچی ڈیوٹی پر تھے، لاہور والی بیٹی کو بھی میں نے فون نہ کرنے دیا کہ اس کا شوہر بیحد مصروف ہے اور بچوں کی وجہ سے خود اس کا آنا بھی مشکل ہے، رہے دولڑکے جو بیرون ملک ہیں، انہیں پریشان کرنے کی کوئی تک نہ تھی، یوں صرف میں اور بیوی ہی گھر پر تھے اور ایک ملازم جو شام ڈھلے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

عصر ڈھلنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ نقاہت کے مارے بات کرنا مشکل ہورہا ہے، میں نے اپنی پرانی ڈائری نکالی بیوی کو پاس بٹھا کر رقوم کی تفصیل بتانے لگا جو مجھے وصول کرنا تھا اور دوسروں کو ادا کرنی تھی، بیوی نے ہلکا سا احتجاج کیا، یہ تو آپ کی پرانی عادت ہے، ذرا بھی کچھ ہوا تو ڈائری نکال کر بیٹھ جاتے ہیں، مگر اس کے احتجاج میں پہلے والا یقین نہیں تھا، پھر سورج غروب ہوگیا، تاریکی اور سردی دونوں بڑھنے لگیں، بیوی میرے لیے سوپ بنانے کچن میں گئی، اس کی غیر حاضری میں میں نے چند اکھڑی اکھڑی سانسیں لیں اور غروب ہوگیا۔

مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میں آہستہ آہستہ اپنے جسم سے باہر نکل رہا ہوں، پھر جیسے میں ہوا میں تیرنے لگا اور چھت کے قریب جا پہنچا، بیوی سوپ لے کر آئی تو میں دیکھ رہا تھا، ایک لمحے کے لیے اس پر سکتہ طاری ہوا اور پھر دھاڑیں مار کر رونے لگی، میں نے بولنے کی کوشش کی، یہ عجیب بات تھی کہ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔

لاہور والی بیٹی رات کے پچھلے پہر پہنچ گئی، کراچی سے بھی چھوٹی بیٹی اور میاں صبح کی پہلی فلائٹ سے پہنچ گئے، بیٹے تینوں بیرون ملک تھے وہ جلد سے جلد بھی آتے تو دو دن لگ جانے تھے، دوسرے دن عصر کے بعد میری تدفین کردی گئی، شاعر، ادیب، صحافی سول سرونٹ سب کی نمائندگی اچھی خاصی تھی، گاؤں سے بھی تقریباً سبھی لوگ آگئے تھے، ننھیال والے، گاؤں سے ماموں زاد بھائی بھی تینوں موجود تھے۔

لحد میں میرے اوپر جو سلیں رکھی گئی تھیں مٹی ان سے گزر کر اندر آگئی تھی، بائیں پاؤں کا انگوٹھا جو آرتھرائٹس کا شکار تھا، مٹی کے بوجھ سے درد کررہا تھا، پھر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، شاید فرشتے آن پہنچے تھے، اسی کیفیت میں سوال جواب کا سیشن شروع ہوا، یہ کیفیت ختم ہوئی، محسوس ہورہا تھا کہ چند لمحے ہی گزرے ہیں مگر فرشتوں نے بتایا کہ پانچ برس ہوچکے ہیں، پھر فرشتوں نے ایک عجیب پیشکش کی۔

''ہم تمھیں کچھ عرصہ کے لیے واپس بھیج رہے ہیں، تم وہاں دنیا میں کسی کو نظر نہیں آ ؤ گے، گھوم پھر کر اپنے پیاروں کو دیکھ لو، پھر اگر تم نے کہا تو تمھیں دوبارہ نارمل زندگی دے دیں گے، ورنہ واپس آ جانا''۔

میں نے یہ پیشکش غنیمت سمجھی اور فوراً ہاں کر دی، یہ الگ بات کہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا، پھر ایک مدہوشی کی حالت چھا گئی، آنکھ کھلی تو میں اپنی گلی میں تھا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے گھر کی جانب چلا، راستے میں کرنل صاحب کو دیکھا، گھر سے باہر کھڑے تھے، اتنے زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے، خواجہ صاحب بیگم کے ساتھ واک کرنے نکل رہے تھے، اپنے مکان کے گیٹ پر پہنچ کر میں ٹھٹھک گیا میرے نام کی تختی غائب تھی، گیرج میں گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی، وفات سے چند ہفتے پہلے تازہ ترین ماڈل کی خریدی تھی، اس کا سن روف بھی تھا اور چمڑے کی اوریجنل سیٹیں تھیں، دھچکا سا لگا، گاڑی کہاں ہو سکتی ہے؟ بچوں کے پاس تو اپنی اپنی گاڑیاں موجود تھیں، تو پھر میری بیوی جواب بیوہ ہو چکی تھی کیا گاڑی کے بغیر تھی؟

دروازہ کھلا تھا، میں سب سے پہلے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنی لائبریری میں گیا، یہ کیا؟ کتابیں تھیں نہ الماریاں، رائٹنگ ٹیبل اس کے ساتھ والی مہنگی کرسی، صوفہ، اعلی مرکزی ملازمت کے دوران جو شیلڈیں اور یادگاریں مجھے ملی تھیں اور الماریوں کے اوپر سجا کر رکھی ہوئی تھیں، بے شمار فوٹو البم، کچھ بھی تو وہاں نہ تھا، مجھے فارسی کی قیمتی، ایران سے چھپی ہوئی کتابیں یاد آئیں، دادا جان کے چھوڑے ہوئے قیمتی قلمی نسخے، گلستاں سعدی کا نادر نسخہ جو سونے کے پانی سے لکھا ہوا تھا اور دھوپ میں اور چھاں میں الگ الگ رنگ کی لکھائی دکھاتا تھا، دادا جان اور والد صاحب کی ذاتی ڈائریاں سب غائب تھیں، کمرہ یوں لگتا تھا، جیسا گودام کے طور پر استعمال ہو رہا ہو، سامنے والی پوری دیوار پر جو تصویر پندرہ ہزار روپے سے لگوائی تھی، جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی، میرے پاس فاؤنٹین پنوں کا بڑا ذخیرہ تھا، پارکر، شیفر، کراس، وہ بھی دراز میں نہیں تھا۔

میں پژمردہ ہو کر لائبریری سے باہر نکل آیا، بالائی منزل کا یہ وسیع و عریض لانج بھائیں بھائیں کر رہا تھا، یہ کیا؟ اچانک مجھے یاد آیا، میں نے چکوال سے رنگین پایوں والے سوت سے بنے ہوئے چار پلنگ منگوا کر اس لانج میں رکھے تھے، شاعر برادری کو یہ بہت پسند آئے تھے، وہ غائب تھے۔

نیچے گرانڈ فلور پر آیا بیوی اکیلی کچن میں کچھ کر رہی تھی، میں نے اسے دیکھا پانچ برسوں میں اتنی تبدیل ہو گئی تھی، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیسے پوچھوں کہ گھٹنوں کے درد کا کیا حال ہے؟ ایڑیوں میں بھی درد محسوس ہوتا تھا، دوائیں باقائدگی سے میسر آ رہی تھیں یا نہیں؟ میں اس کے لیے باقائدگی سے پھل لاتا تھا، نہ جانے بچے کیا سلوک کر رہے ہیں، مگر میں تو بول نہیں سکتا تھا، نہ ہی وہ مجھے دیکھ سکتی تھی۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، بیوی بہت دیر باتیں کرتی رہی، جو کچھ اس طویل گفتگو سے میں سمجھا، وہ یہ تھا کہ بچے اس مکان کو فروخت کرنا چاہتے تھے، ماں نے مخالفت کی کہ وہ کہاں رہے گی، بچے مصر تھے کہ ہمارے پاس رہیں گی، بیوی کو میری نصیحت یاد تھی کہ ڈیرہ اپنا ہی اچھا ہوتا ہے مگر وہ بچوں کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال رہی تھی، گاڑی کا معلوم ہوا کہ بیچی جا چکی تھی، بیوی نے خود ہی بیچنے کے لیے کہا تھا کہ اسے ایک چھوٹی سی آلٹو ہی کافی ہو گی۔

اتنے میں ملازم لانج میں داخل ہوا، یہ نوجوان اب ادھیڑ عمر لگ رہا تھا، میں اس کا لباس دیکھ کر ٹھٹھک گیا، اس نے میری برانڈڈ قمیص جو ہانگ کانگ سے خریدی تھی، وہ پہنے ہوئے تھا،

نیچے وہ پتلون تھی جس کا فیبرک میں نے اٹلی سے لیا تھا، اچھا تو میرے بیش بہا ملبوسات ملازموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

میں ایک سال لوگوں کی نگاہوں سے غائب رہ کر سب کو دیکھتا رہا، ایک ایک بیٹے بیٹی کے گھر جا کر ان کی باتیں سنیں، کبھی کبھار ہی ابا مرحوم کا یعنی میرا ذکر آتا، وہ بھی سرسری سا، ہاں! زینب! میری نواسی، اکثر نانا کا تذکرہ کرتی رہتی ہے، ایک دن ماں سے کہہ رہی تھی، اماں یہ بانس کی میز، کرسی نانا لائے تھے، جب میں چھوٹی سی تھی، اسے پھینکنا نہیں، ماں نے جواب میں کہا: ’’جلدی سے کپڑے بدل کر کھانا کھا، پھر مجھے میری سہیلی کے گھر ڈراپ کرو‘‘۔

میں شاعروں، ادیبوں کے اجتماعات اور نشستوں میں گیا، کہیں اپنا ذکر نہیں سنا، وہ جو بات بات پر مجھے جدید غزل کا ٹرینڈ سینٹر کہا کرتے تھے، جیسے بھول ہی تو چکے تھے، اب ان کے ملازموں نے میری کتابیں ڈسپلے سے ہٹا دی تھیں، ایک چکر میں نے قبرستان کا لگایا، میری قبر کا برا حال تھا، گھاس اُگ آئی تھی، کتبہ پرندوں کی بیٹ سے اٹا پڑا تھا، ساتھ والی قبروں کی حالت بھی زیادہ بہتر نہ تھی۔

ایک سال کے جائزے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میری موت سے دنیا کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا، رتی بھر بھی نہیں، بیوی یاد کر لیتی تھی، تاہم بچے، پوتے، نواسے، پوتیاں سب بھول چکی تھیں، ادبی حلقوں کے لیے میں اب تاریخ کا حصہ بن چکا تھا، جن بڑے بڑے محکموں اور اداروں کا میں سربراہ رہا تھا، وہاں ناموں والے پرانے بورڈ تک ہٹ چکے تھے اور نئے بورڈ بھی مسلسل بھرتے جا رہے تھے، دنیا رواں دواں تھی، کہیں بھی میری ضرورت نہ تھی، گھر میں نہ باہر۔

پھر تہذیبی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں تیزی سے آ رہی تھیں اور آئے جا رہی تھیں، ہوائی جہازوں کی رفتار چار گنا بڑھ چکی تھی، دنیا کا سارا نظام سمٹ کر موبائل فون کے اندر آ چکا تھا، میں ان جدید ترین موبائلوں کا استعمال ہی نہ جانتا تھا۔

فرض کیجئے! میں فرشتوں سے التماس کر کے دوبارہ دنیا میں نارمل زندگی گزارنے آ بھی جاتا تو کہیں خوش آمدید نہ کہا جاتا، بچے پریشان ہو جاتے، ان کی زندگیوں کے اپنے منصوبے اور پروگرام تھے جن میں اب میری گنجائش کہیں نہیں تھی، ہوسکتا ہے بیوی بھی کہہ دے کہ تم نے واپس آ کر میرے مسائل میں اضافہ کر دیا ہے، مکان بک چکا ہے، میں ایک تو کسی بچے کے پاس رہ لیتی، دو کو اب وہ کہاں سنبھالتے پھریں گے، دوست تھوڑے یہ اب باقی بچے تھے، وہ بھی اب بیمار اور چل چلا کے مراحل کا سامنا کر رہے تھے! میں واپس آتا تو دنیا میں مکمل طور پر اَن فِٹ ہوتا، نئے لباس میں پیوند کی طرح، جدید بستی میں پرانے مقبرے کی مانند! میں نے فرشتے سے رابطہ کیا اور اپنی آخری چوائس بتا دی، میں واپس قبر میں جانا چاہتا ہوں! فرشتہ مسکرایا، اس کا کمنٹ بہت مختصر تھا، ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ اس کے بعد جو خلا پیدا ہوگا، کبھی بھرا نہیں جا سکے گا، مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ خلا تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔

❁❁❁❁

ہارون نے کہا وقت رحیل اپنے پسر سے
جائے گا کبھی تو بھی اسی راہ گزر سے

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

❁❁❁❁

اصلاحیات

اللہ تعالی کی مخلوق

’’جنوں‘‘ کے حالات اوران کے مکروفریب سے حفاظت کی دعائیں

مولانا محمد عمر صاحب قاسمی مجاہد پوری

’’جن‘‘ پرانی مستور مخلوق ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام اور بنی آدم کی تخلیق سے پہلے دنیا میں موجود ہے، ان میں بھی اچھے برے، عالم جاہل، نیک وبد، شریف وسرکش، مومن اور کافر سب قسم کے افراد ہوتے ہیں، اللہ تعالی کی طرف سے یہ مخلوق بھی توحید ورسالت، عبادات واحکام خداوندی کے ایسے ہی مکلّف ہیں جیسے انسان، اللہ تعالی نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا: ’’وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالِانْسَ اِلَّالِيَعْبُدُوْنَ‘‘ اور میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں، یعنی ان کے پیدا کرنے سے شرعاً بندگی مطلوب ہے، بندگی کا حکم صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ تم میری شہنشاہی اور عظمت کبریائی کا قولاً وفعلاً اعتراف کر کے میرے خصوصی الطاف ومراحم کے مورد ومستحق بنو: ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

حضرت خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات کو فرشتوں سے سن کر کچھ آسمانی خبریں معلوم ہوجاتی تھیں، جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوتی وہ سلسلہ بند ہوگیا اور کثرت سے ان پر شہب (راکٹوں) کی مار پڑنے لگی، جنوں کو گمان ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر سخت پہرے بٹھادئے گئے ہیں، اسی کی جستجو کے لئے جنوں کے مختلف گروہ مشرق ومغرب میں پھیل پڑے، ان میں سے ایک جماعت بطن نخلہ کی طرف گزری وہاں اتفاق سے اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا فرما رہے تھے، اللہ تعالی نے جنوں کی اس جماعت کا رخ قرآن مجید سننے کے لئے ادھر پھیر دیا، قرآن مجید کی آواز انہیں بہت عجیب ومؤثر ودلکش معلوم ہوئی اوراس کی عظمت وہیبت ان کے دلوں پر چھاگئی وہ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو، آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کرلیا اور وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روک دیا ہے۔

بہرحال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم اور نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو جنات قرآن کریم کی آواز پر فریفتہ ہوکر سچے دل سے ایمان لے آئے، پھر اپنی قوم کے پاس جاکر سب ماجرا بیان کیا کہ ہم نے ایک کلام سنا ہے، جو اپنی فصاحت وبلاغت حسن اسلوب قوت تاثیر شیریں بیانی طرز موعظت اور علوم ومضامین کے اعتبار سے عجیب وغریب ہے، معرفت ربانی اور رشد وفلاح کی طرف رہبری کرتا ہے اور طالب خیر کا ہاتھ پکڑ کر تقوی کی منزل پر پہنچادیتا ہے، اس لئے ہم سنتے ہی بلاتوقف اس پر یقین لائے اور ہم کو کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا کہ ایسا کلام اللہ تعالی کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا، احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنات کے آنے جانے، سننے اور سنانے کا پتہ نہیں لگا، البتہ ایک درخت نے باذن اللہ کچھ اجمالی اطلاع

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کودی، اس کے بعد مفصل حال بذریعہ وحی سورۂ جن میں بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوخطاب فرمایا:"قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ، الخ" آپ فرمادیجئے! کہ میرے پاس یہ وحی آئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے میری بات سننے کے لئے دھیان دیا، پھرانہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے، جو ہدایت کا راستہ بتاتا ہے،سووہ اس پر ایمان لے آئے اورہم اپنے رب کے ساتھ ہرگز کسی کوشریک نہ ٹھہرائیں گے۔(جنات کا پورا بیان سورۂ جن میں ہے)

جنات کی قسمیں:

"عن ابی ثعلبة الخشنی قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الجن ثلاثة اصناف: صنفٌ لهم اجنحةٌ یطیرون فی الهواء، وصنف حیات و کلاب، وصنف یحلون ویظتنون"۔(کنزالعمال)

حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنات تین قسموں پر مشتمل ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جن کے پر ہوتے ہیں، وہ اپنے پروں کے ذریعہ ہواؤں میں اڑتے ہیں۔

دوسری قسم وہ جنات ہیں جو سانپ اور کتوں (بچھواور درندوں) کی شکل میں ہوتے ہیں۔

تیسری قسم وہ جنات ہیں جوکسی بھی چیز میں(انسانوں میں بھی) حلول کرجاتے ہیں اور روئے زمین پر سفرکرتے ہوئے گشت لگاتے رہتے ہیں۔

جنات مارنے کے متعلق فرمان رسولؐ:

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گھروں کے سانپوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"جب تم ان سانپوں میں سے کوئی سانپ کواپنی رہائش گاہ میں دیکھو،تو تم یوں کہوکہ تم کوحضرت نوح علیہ السلام کے اس عہدو پیمان کی قسم دیکر کہتے ہیں جوتم سے انہوں نے عہد لیا ہے اوراس عہد کی قسم دیکر کہتے ہیں جوعہدتم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا کہ تم ہم کو نقصان نہ پہنچاؤ اور چلے جاؤ؛لیکن اگر پھربھی لوٹ کرآتے ہیں توانہیں قتل کردو،اس لئے کہ وہ حقیقی سانپ ہے"۔(ابوداؤشریف)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گھروں میں اورانسانی رہائش گاہوں میں سانپ کی شکل میں جنات پھرتے رہتے ہیں وہ انسانوں کونقصان نہیں پہنچاتے، اس لئے جب ان کے بارے میں یہ پتہ چل جائے کہ وہ حقیقی سانپ نہیں ہیں،توان کو مارنے کی اجازت نہیں ہے۔

غزوہ خندق سے واپس آکر سانپ کے مارنے کاواقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابوسائب مولی ہشام بن زہرہ تابعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے گھر گیا تودیکھا آپ نماز پڑھ رہے تھےتومیں آپ کے نماز سے فارغ ہونے کےانتظار میں بیٹھ گیا،اتنے میں میں نے ایک چارپائی کے نیچے جومکان کےایک گوشہ میں بچھی ہوئی تھی،کسی چیز کی سرسراہٹ سنی،دیکھا توسانپ تھا،میں اسے مارنے کے لئے اٹھا تو حضرت ابوسعید خدری نے انگلی کے اشارے سے منع فرمایا میں رک گیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے گھرکےایک کمرے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا،تم نے اس کمرے کودیکھا ہے، میں نے کہا جی ہاں! اس کے بعد کہنے لگے،اس کمرے میں ہمارے گھرانے کاایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، رہا کرتا تھا ہم لوگ اس نوجوان کے ساتھ غزوۂ خندق کے سلسلہ میں رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے باہر گئے ہوئے تھے یہ نوجوان نصف النہار (دوپہر) کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر گھر آجاتا اور پھر لوٹ جاتا تھا، ایک دن اس نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جایا کرو تو اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لے جایا کرو کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بنی قریظہ تمہیں تکلیف نہ پہنچاویں، چنانچہ اس نے اپنا نیزہ اپنے ساتھ لے لیا، جب وہ گھر پہنچا تو بیوی کو دیکھا کہ وہ (بے حجاب) دروازے پر کھڑی ہے، یہ دیکھ کر اس کو غیرت آئی اور بیوی کو مارنے کے لئے اپنا نیزہ سیدھا کر لیا، اس نے کہا کہ اپنا ہاتھ تھام لو اور ذرا گھر میں چل کر دیکھو کیا معاملہ ہے اور میں کس وجہ سے باہر کھڑی ہوں، چنانچہ جب وہ اندر گیا تو دیکھا کہ ایک بڑا سانپ کنڈلی مارے بستر پر بیٹھا ہوا ہے، نوجوان نے اس سانپ کو نیزہ میں بیندھ کر گھر میں نیزہ کھڑا کر دیا، سانپ نے تڑپ کر اس نوجوان کو کاٹ لیا، نوجوان فوراً مردہ ہو کر زمین پر گر پڑا، ساتھ ہی سانپ بھی مر گیا، معلوم نہیں کہ پہلے کون مرا، سانپ یا نوجوان۔

پھر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کی اطلاع کی اور عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان کے لئے زندہ ہونے کی دعا فرمادیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے رفیق کے لئے مغفرت کی دعا کرو (گویا آپ اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے) پھر فرمایا کہ مدینہ منورہ میں کچھ جنات ہیں جو اسلام لے آئے ہیں، لہٰذا جب تم کسی سانپ کو گھر میں دیکھو تو مارنے سے پہلے تین دن تک اس کو تنبیہ کرو اور اگر اس کے بعد وہ تمہارے سامنے آئے تو مار ڈالو، کیونکہ یقیناً پھر وہ شیطان (جن) ہے۔

(مسلم شریف جلد۲ صفحہ ۲۳۵)

حضرت شاہ اھل اللہ اور جن صحابی کا واقعہ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بھائی حضرت شاہ اہل اللہ صاحب کا مشہور واقعہ ہے، دہلی میں ان کا قیام تھا، بزمانہ شاہی حکومت وہ ایک مسجد میں تلاوت فرمار ہے تھے، اچانک سانپ کا بچہ سامنے آ گیا، شاہ اہل اللہ صاحب نے سانپ کے بچے کو قتل کر دیا، تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی وردی پہنے آئے اور کہنے لگے کہ آپ کو بادشاہ بلا رہے ہیں (شاہ صاحب سمجھے کہ انسانوں کے باشادہ بلا رہے ہیں) شاہ صاحب ان دو آدمیوں کے ساتھ چل دئے اور چلتے چلتے ویران جگہ پر پہنچے، شاہ صاحب نے خیال کیا کہ بادشاہ شکار کے لئے جنگل تشریف لے گئے ہوں گے وہیں بلا رہے ہوں گے، پھر چلتے چلتے عجیب وغریب علاقہ نظر آیا، اس زمین کے اندر ایک بہت بڑا دروازہ نظر آیا جب اس میں سے اندر داخل ہوگئے تو دیکھا کہ جنات کے بادشاہ تشریف فرما ہیں اور جنات کے درمیان فیصلے کر رہے ہیں، شاہ اہل اللہ سلام کر کے مجلس کے کنارے بیٹھ گئے، بادشاہ نے فراغت کے بعد شاہ صاحب کو طلب کیا اور مدعی بھی آ گیا، اور اس نے دعوی کیا کہ انہوں نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے اور میں قصاص لینا چاہتا ہوں، مدعی علیہ شاہ اہل اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا، مدعی نے کہا کہ سانپ کی شکل میں قتل کیا ہے، شاہ صاحب نے سانپ کے بچے کے قتل کا اقرار کیا، بادشاہ نے مدعی اور مدعی علیہ کے بیانات سن کر قصاص کا فیصلہ صادر کر دیا، اسی وقت ایک جن صحابی نے سامنے آ کر بیان کیا: "سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ: "مَنْ قَتَلَ فِيْ غَيْرِ زِيِّهٖ فَدَمُهٗ هَدَرٌ" میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص اپنی اصلی شکل کے علاوہ دوسری شکل میں قتل کیا جائے تو اس کا خون معاف ہے، بادشاہ نے حدیث مبارک سن کر شاہ صاحب کو رہا کر دیا اور شاہ اہل اللہ

صاحب کوان کی قیام گاہ پر پہنچانے کا حکم دیا۔(مسلسلات مسند الجن صفحہ ۱۷۹/۱۸۰ مطبع دارالکتاب)

معلوم یہ ہوا کہ جنات کی ایک قسم سانپ کی شکل میں انسانوں کے سامنے آتی ہے اور کبھی کتے اور گیدڑ اور بھیڑیے کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

جنات کی تیسری قسم:

جنات کی تیسری قسم انسانوں کی شکل میں ہوتی ہے، اس کی دوصورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) انسانوں میں سرایت کرجاتے ہیں، انسانوں پرسوار ہوکر انسانوں کی طرح بولتے ہیں، دوسرے زمین پر گھومتے پھرتے ہیں ان میں اچھے اور برے دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔

جنات وشیاطین سے حفاظت کی دعائیں اور تدابیر:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جناتوں نے حملہ کیا تھا میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، جناتوں کی ایک جماعت نے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلہ کو لیکر کے حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کردیا تو جبرئیل امین علیہ السلام نے آکر فرمایا:''میں آپ کو کچھ ایسے کلمات بتادیتا ہوں جب آپ ان کلمات کو پڑھ لیں گے، تو جناتوں کی آگ بجھ جایا کرے گی اور جنات نامراد اورناکام واپس چلے جایا کریں گے'' وہ کلمات یہ ہیں:

پہلی دعا:

"اعوذ لوجه الله الكريم و كلمات الله التامة التى لايجاوزهن بر ولا فاجر من شر ماينزل من السماء ومايعرج فيها ومن شر ما ذرا فى الارض وما يخرج منها ومن شر فتن الليل والنهار ومن شر طوارق الليل والنهارالا طارقٌ يطرق بخير يا رحمٰن"۔(مسند امام احمد بن حنبل)

ترجمہ: میں اللہ کی عزت وشان اوراس کے مرتبہ کے ذریعہ سے اور اللہ کے ان کامل ومکمل کلمات کے ذریعہ سے پناہ چاہتا ہوں جن سے نیک اور فاجروفاسق آگے بڑھ کرتجاوز نہیں کرسکتے اوران چیزوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جوآسمانوں سے اترتی ہیں اورآسمانوں میں چڑھتی ہیں اوران چیزوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جوروئے زمین پر پیدا ہوتی ہیں اورزمین سے نکلتی ہیں اوردن رات میں چلنے والوں کی رفتار کے شر سے پناہ چاہتا ہوں مگر ایسے چلنے والے سے جواپنے ساتھ خبر لیکر آنیوالے ہوں اے بڑے مہربان۔

دوسری دعا:

جس شخص پر جن کا اثر ہواس کو سامنے بٹھا کر مندرجہ ذیل سورتیں اورآیات پڑھ کردم کیا جائے:

(۱) سورۂ فاتحہ۔

(۲) سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ''الم'' سے "المفلحون" تک''۔

(۳)"والهكم اله واحد" آخرآیت تک۔

(۴) آیت الکرسی۔

(۵) سورۂ بقرہ کا آخری رکوع۔

(۶)"شَهِدَاللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّاهُوَ" آیت کے ختم تک۔

(۷)"اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ" آخری آیت تک۔

(۸)"فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ" سورۂ مومنوں کے ختم تک۔

(۹) سورۂ صافات کی شروع کی دس آیات۔

(۱۰) تین آیات سورۂ حشر کے آخر سے۔

(۱۱) سورۂ جن کی آیات:"وَاَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا" آیت کے ختم تک۔

(۱۲) سورۂ'' قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ''۔

(۱۳) سورۂ "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ"۔

(۱۴) سورۂ "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ"۔(ابن ماجہ شریف)

تیسری دعا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت الکرسی جس بچہ اور مال پر رکھ دی جائے، یعنی اس کو پڑھ کر دم کر دیا جائے یا لکھ کر رکھ دی جائے، شیطان اس کے قریب نہیں آئیگا۔(ابن حبان)

چوتھی دعا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں "آمن الرسول" سے ختم سورت تک ایسی ہیں کہ جس گھر میں تین رات تک پڑھی جائیں شیطان اس کے قریب نہیں آئے گا۔(ترمذی شریف)

پانچویں دعا:

"اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَاتِ کُلِّھَا مِنْ شَرِّمَاخَلَقَ"

جو شخص اپنی رہائش گاہ میں یہ دعا پڑھے گا تو وہ ہر مخلوق کے نقصان سے محفوظ رہے گا اور اسی طرح راستہ چلتا ہوا مسافر جب کسی منزل پر قیام کرتے وقت یہ دعا پڑھے گا، تو جنات وشیاطین وحشرات الارض اور ہر طرح کی مخلوق کی طرف سے نقصان اور تکلیف سے محفوظ رہے گا، انشاءاللہ۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت خولہ بنت حکیم سے روایت کردہ حدیث شریف میں حضرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا ارشاد فرمائی ہے:

"عن خوله بنت حكيم السلمة تقول سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول من نزل منزلا ثم قال اعوذ بكلمات اللّٰه التامات كلها من شرماخلق لم يضره شئٌ حتى يرتحل من منزله ذلك"۔

حضرت خولہ بنت حکیم سلمیہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ جو شخص کسی منزل پر اترے تو یہ کلمات پڑھے، اس کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، یہاں تک کہ وہ شخص اپنی اس منزل کو چھوڑ کر کوچ کر جائے۔

جنات سے بچنے کی تدبیر:

جنات اگر سانپ وغیرہ کی شکل میں نظر آئیں تو یوں کہو ہم تم کو حضرت نوح علیہ السلام کے اس عہد و پیمان کی قسم دیکر کہتے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے تم سے لیا ہے، اور اس عہد و پیمان کی قسم دیکر کہتے ہیں جو تم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا ہے کہ تم ہم کو نقصان نہ پہنچاؤ اور چلے جاؤ؛ لیکن اگر پھر بھی لوٹ کر آگے آئے تو انہیں قتل کر دو اس لئے کہ وہ حقیقی سانپ ہے۔

❁❁❁

اسلام کی اجتماعی شکل مدارس دینیہ ہیں

اصلاحی کام کرنیوالوں کو ہر حال میں اپنے پروگرام میں اٹل رہنا چاہئے، صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا چاہئے، واضح رہے کہ یہاں صبر کا یہ مفہوم قطعاً غلط ہوگا کہ آپ کسی کو کچھ بھی نہ کہیں؛ بلکہ آپ کو خیر کے کام پر ہر حال میں ڈٹے رہنا ہے، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری "انوار انوری" میں رقمطراز ہیں: "ہماری قسمت میں ان لوگوں کو سمجھانا ہے کہ جن کو سمجھنا ہی نہیں ہے، بہر حال ہمیں اجر یقیناً ملے گا جب بھی کہیں سے حق کام کرتے وقت رکاوٹ آتی ہے، تو علامہ کے اس فرمان سے دل باغ و بہار ہو جاتا ہے اور حوصلہ بڑھتا ہے "ہمارا کام ہے راتوں کو کاٹنا یاد دلبر میں"۔

دور حاضر میں اسلام کی اجتماعی شکل مدارس دینیہ ہیں جن کا وجود اور ان میں علماء وطلبہ کا ہجوم پیغمبر اسلام کا عظیم معجزہ ہے۔

❁❁❁